مرکز مذہبی تحقیقات ورہنمائی (CRSG) علی گڑھ کی پیش کش

ہندتو

ایک تحقیقی مطالعہ

مفتی محمد مشتاق تجاروی

رکن مرکز مذہبی تحقیقات ورہنمائی علی گڑھ

ترتیب

پیش لفظ

ہمارے ملک کے مسائل ہیں اگر کوئی مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور ساتھ ہی بیحد پیچیدہ اور مشکل ہے تو وہ ہندتو کا مسئلہ ہے۔ سب سے زیادہ اہم اس اعتبار سے کہ ملک کی اکثریت کا ایک خاصا ذہین اور بااثر حصہ اسے ہندستان کے گونا گوں مسائل کا واحد حل سمجھتا ہے۔ ملک آج جن اخلاقی وسماجی، تہذیبی وثقافتی، لسانی وتعلیمی حتی کہ سیاسی ومعاشی مشکلات سے دوچار ہے ان سے نمٹنے کا واحد راستہ اسی کو قرار دیتا ہے۔

پیچیدہ اور مشکل اس معنی میں سارے شور وغوغا کے باوجود ہندتو کا کوئی واضح تصور اب تک سامنے نہیں آپایا ہے۔ اس نظریے کے امتیازی عناصر کیا ہیں؟ اس کی عمارت کن بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے؟ یہ عناصر اور یہ بنیادی تصورات کتنے معتدل ہیں اور ان سے کن مفید نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے؟ ہندو دھرم سے ہندتو کس معنی میں مختلف ہے اور کس معنی میں ایک؟ ہندستان کے دوسرے مذاہب کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہوگا؟ ہندستان کی تاریخ کو وہ کس نظر سے دیکھتا ہے، کس کو ہندستانی اور کس کو غیر ہندستانی کہتا ہے اور کیوں؟ ان سوالات کا کوئی متفقہ اور قابل فہم جواب سامنے نہیں آیا ہے۔

اسی طرح یہ واضح کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے کہ زندگی کے بنیادی مسائل میں ہندتو کا نظریہ کیا رہنمائی دیتا ہے۔ اس کی روشنی میں جو افراد تیار ہورہے ہیں یا آئندہ ہوں گے وہ انسانیت کی کن صفات عالیہ سے متصف ہیں یا ہوں گے؟ یا جس معاشرے کی تشکیل ہندتو کے پیش نظر ہے وہ تفریق وامتیاز، نفرت وحقارت، ظلم واستحصال کی مختلف شکلوں سے کس طرح پاک ہوگا۔ اخوت ومساوات، عدل وانصاف، محبت واحسان کی اعلیٰ قدروں کا کس طرح حامل ہوگا؟ آج کا انسان اپنے حقوق کا جو شعور رکھتا ہے، اپنی جان ومال کا جو احترام، عزت وآبرو کا جو تحفظ،

فکر وعمل کی جو آزادی، مذہب اور مسلک کا جو اختیار چاہتا ہے ہندتو کا نظریہ اپنی ہزار ہا سال قدیم روایات، ذات و برادری کی غیر مساوی تقسیم اور طبقاتی نظام کی پابندیوں کے ساتھ ان قدروں کی تکمیل کیسے کرے گا؟

یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل پیش نظر کتاب کا موضوع ہیں، مصنف نے بحث میں ہندستان کے مختلف مذاہب، علاقوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ایک حصہ خاص طور پر مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ ہندتو کے نقطۂ نظر اور اس کے حاملین کے بیانات سے بحث کرتا ہے۔ کتاب کی ترتیب میں ہندی، انگریزی، اور اردو میں جو مواد موضوع سے متعلق مل سکا سب سے استفادے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسائل کے تجزیے میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر پر تبصرے میں عدل و انصاف کا اہتمام کیا گیا ہے۔۔ زبان و بیان میں علمی معیار پیش نظر رہا ہے۔

کتاب کے مؤلف مولانا محمد مشتاق تجاروی سنٹر فار ریلجس اسٹڈیز اینڈ گائڈینس کے ایک معزز رکن ہیں، انہوں نے کئی مقالات اور کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔ تصوف کے موضوع پر میری ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ''تصوف اور شریعت'' کے عنوان سے کیا ہے۔ جسے حال ہی میں مرکزی مکتبہ اسلامی نے شائع کیا ہے۔ پیش نظر کتاب مولانا تجاروی کی پہلی تصنیف ہے جو سینٹر پیش کر رہا ہے۔ امید ہے کہ کتاب موضوع کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی اور دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری

ڈائریکٹر

سینٹر فار ریلجس اسٹڈیز اینڈ گائیڈنس، علی گڑھ

٦ ستمبر ٢٠٠٠ء

باب اول

ہندتو کی حقیقت و ماہیت

ہندتو بظاہر ایک مذہبی اصطلاح ہے۔ لیکن موجودہ مفہوم میں اس لفظ کا استعمال قدیم نہیں ہے اور نہ اس مفہوم کے اعتبار سے اس کا محور ہندو مذہب ہے۔ بلکہ یہ ایک مخصوص قسم کا فلسفہ ہے، جس کی شناخت کسی مخصوص مذہب یا طریقہ عبادت سے نہیں بلکہ ایک علاقائی تہذیب و ثقافت سے ہوتی ہے جب کہ اس کے شارحین نے مختلف اور بسا اوقات متضاد باتیں کہی ہیں۔ انہوں نے مجموعی طور پر اس لفظ کو مذہب کے معنی میں نہیں لیا۔ وہ اس سے ایک مخصوص تہذیب (Culture) مراد لیتے ہیں۔ آیندہ سطور میں ہم اس لفظ کے معنی و مفہوم اور عناصر ترکیبی پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

ہندو کے لغوی معنی

ہندتو हिन्दुत्व کا لفظی ترجمہ ''ہندو پن'' یا ''ہندو ہونا'' ہوتا ہے۔ جس طرح کہ بندھتو کا ترجمہ بھائی ہونا ہے۔ اپنے موجودہ مفہوم میں ہندتو کسی مذہب کی نمائندگی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا استعمال ایک ایسے سماج یا گروہ کے لیے کیا جاتا ہے، جو ہندستان کی ''جغرافیائی حدود'' کے اندر کچھ مخصوص تصورات، اقدار اور روایات کے ساتھ رہتا ہو۔ خواہ عملی یا فکری اعتبار سے وہ باہم کتنا ہی مختلف الخیال یا متضاد کیوں نہ ہو۔ البتہ اس کے اندر ہندستان کی تقدیس، اس کے لائق پرستش ہونے اور آباء و اجداد کی پیغمبرانہ عظمت کا تصور پایا جاتا ہو۔ اگر اس کے اندر بھارت کی عظمت کا تصور نہ ہوگا، تو گویا وہ سماج یا گروہ اس مطلوبہ سماج یا گروہ کا حصہ نہ ہوگا اور نہ اس پر ہندتو کا اطلاق ہوگا۔[1]

اس لفظ کا ماخذ 'ہندو' ہے۔ 'لفظ' ہندو یا ''ہند'' کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ تاہم اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس لفظ کا قدیم استعمال جغرافیائی اصطلاح کے طور پر تھا۔ اس علاقے کو یہ نام قدیم ایرانیوں نے دیا تھا۔[۲] یہ لفظ سندھ سے بنا ہے۔ چونکہ فارسی میں س کو ہ سے بدلنے کا رواج ہے۔ اس لیے انہوں نے سندھ کو ہند کر دیا۔

اگر چہ اس کا قطعی ثبوت موجود نہیں ہے تاہم قرین قیاس یہی بات ہے کہ اہل ایران اور عربوں نے ہندستان کے تمام مذاہب میں بت پرستی کا غلبہ دیکھا تو ان سب کو عقاید ہندواں کہہ دیا اور بعد میں یہی لفظ ہندو مذہب بن گیا، جسے ہندوؤں نے اپنے مذہب کی شناخت کے لیے اختیار کر لیا۔ اس خیال کی تائید ساورکر کے اس جملے سے بھی ہوتی ہے کہ ''اگر چہ یہ لفظ دوسروں کا دیا ہوا ہے، مگر اس سے ہماری ماضی کی عظمتوں کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے اس کو قبول کر لیا ہے۔''[۳]

ہندو مذہب کی تعریف

لفظ ہندو کی اصل کے بارے میں اختلاف کی وجہ سے ہندو مذہب کی تعریف بھی مشکل ہوگئی۔ ہندتو کے حامی سیاسی مبصرین جو یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان میں صرف ہندو قوم ہی کو رہنے کا حق ہے، وہ اس لفظ کی ایسی تاویل کرنا چاہتے ہیں کہ اس لفظ میں ہندی الاصل تمام عقاید و مذاہب شامل ہو جائیں اور مسلمان، یہودی، عیسائی اور مجوسی اس سے مستثنیٰ ہو جائیں۔

بعض نے بدھوں کو ہندو مذہب سے خارج قرار دینا چاہا اور بعض مذاہب نے خود اپنے آپ کو ہندو شناخت سے دور رکھنا چاہا لیکن ایک مخصوص طبقہ جس کے فلسفے کی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی، برابر اصرار کر رہا ہے کہ تمام ہندی الاصل مذاہب اس میں شامل ہیں اور ان مذاہب کا باہم مختلف ہونا اس لفظ کی جامعیت کی دلیل ہے۔

ہندو مذہب کی تعریف میں متعدد باتیں کہی گئی ہیں۔ لیکن اب تک اس کا صحیح مفہوم متعین نہیں کیا جاسکا۔ مثلاً سوامی وویکانند نے لکھا ہے ''جو اپنے آپ کو ہندو سمجھے وہ ہندو ہے۔''[۴] ایک اور مصنف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جو گائے نہ کھاتا ہو وہ ہندو ہے۔ گائے ہی دھرم ہے، گائے ہی وید ہے۔ ایک نے لکھا کہ جو گائے کی پوجا کرے وہ ہندو ہے۔[۵] وغیرہ۔ چونکہ یہ تمام تعریفیں تعریف کے دائرے میں نہیں آتیں اور ان سے بات اور پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ اس

لیے دوسرے انداز پر اس کی تعریف کرنی شروع کی کہ اس لفظ سے ایک مخصوص قسم کے سماج کا تصور ابھرتا ہے۔ ہم بھی اس کو انہی معنوں میں لیتے ہیں۔ اس کی کوئی متعینہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔[۶]

آر۔ ایس۔ ایس کے فکری رہنما اور دوسرے سرسنگھ چالک گرو گولوالکر سے پوچھا گیا کہ سوامی دیانند سرسوتی یہ کہتے تھے کہ ہندو غیر ملکیوں کا دیا ہوا نام ہے۔ اس کے معنی ڈاکو کے ہوتے ہیں۔ گولوالکر نے جواب دیا: ''میں مؤرخ ہونے کا تو دعوی نہیں کرتا البتہ لفظ ''ہندو'' کو صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ عام ہو چکا ہے اور لوگوں نے اس کو قبول بھی کر لیا ہے۔''[۷]

ایک اور موقعے پر گولوالکر نے اس لفظ کو ہندی الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھا ہے: 'لفظ ہندو دو اجزا کا مرکب ہے ہ(Hi) اور اندو (indu) ہِ ہمالیہ سے لیا گیا ہے اور اندو۔ اندوسرو ور سے۔ اس لیے ہند سے مراد وہ سرزمین ہے جو ہمالیہ اور بحر ہند کے درمیان واقع ہے[۸] اس سلسلے میں اگا تھا برسپتی کا درج ذیل اشلوک بطور استدلال نقل کیا ہے

हिमालयं समारभ्य यावदिं दुसरोवरमृ

तं देवनिर्मितम् देशं ही दुस्थानं प्रच्क्षयते''

لیکن اس سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ یہ ہندستان کی جغرافیائی حدود کا تذکرہ ہے، ہندو مذہب کا نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگا تھا برسپتی دسویں صدی کے بعد کا شاعر ہے، جبکہ لفظ ہند کا اطلاق اس سے پرانا ہے۔ اس لیے اس لفظ کی اصل کے بارے میں بعد کی تاویل دلیل نہیں بن سکتی۔

اس تمہید سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصل مراجع کی روشنی میں یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ ہندو مذہب یا ہندو دھرم کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ یہ لفظ نہ تو ہندستان میں آباد قدیم ہندی الاصل اقوام پر پورے طور پر صادق آتا ہے نہ ہی تمام بت پرست مذاہب پر۔

ہندتو

اس لیے ہندتو کے علم برداروں خاص طور پر آر۔ ایس۔ ایس کے فکری رہنماؤں نے اس لفظ کی تشریح اپنے طور پر کرنی شروع کی اور ہندتو کے عنوان سے اپنا فلسفہ پیش کیا کہ ہندتو کوئی مذہب نہیں بلکہ ایک کلچر (تہذیب) ہے۔[۹] اور مذہب کو قومی کلچر قرار دینے کے بعد مختلف انداز سے اس کی تعریفیں کیں۔ مثلاً گولوالکر نے ایک جگہ لکھا ہے: ''قوم کا لفظ پانچ چیزوں سے مرکب

ہے۔ وحدت جغرافیہ، وحدت نسل، وحدت مذہب، وحدت تہذیب اور وحدت زبان، جب یہ پانچ عناصر کسی قوم میں پائے جائیں تو وہ ایک قوم کہلاتی ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک عنصر بھی نہ پایا جائے تو پھر اس قوم پر ایک قوم کا اطلاق درست نہیں ہوگا۔[۱۰]

لیکن یہ تعریف بھی ناقص ہے اور اس کا ہر جز اس کی نفی کرتا ہے۔ ہندستان میں ان پانچ چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی مشترک نہیں ہے۔ یہاں مذاہب جدا جدا ہیں، جغرافیائی حدود کا یہ عالم ہے کہ معلوم تاریخ میں ایک جغرافیائی وحدت کے بطور لفظ ہندستان کا استعمال مسلمانوں نے اپنے زیر نگیں علاقوں کے لیے کیا ہے ورنہ قدیم تاریخ میں متعدد ممالک تھے اور ان کے راجہ الگ الگ تھے اور ہندستان کے بھرت کھنڈ اور آریہ ورت وغیرہ بیسیوں نام تھے، جن کی اپنی جغرافیائی حدود تھیں۔ آریہ ورت ایک علاقہ تھا، جس میں صرف شمالی ہند شامل تھا۔ ہندستان کے ان قدیم ناموں اور ان کی جغرافیائی حدود کی تفصیلات بنجامن واکر (Benjamin Walkar) نے اپنی کتاب Hindu World میں پیش کی ہے۔[۱۱]

اس طرح ہندستان میں نہ نسل مشترک ہے نہ زبان۔ یہ سب ایسے نمایاں حقائق ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

گولوالکر نے ہندو کو ایک قوم کے مفہوم بلکہ جغرافیائی اصطلاح کے مفہوم میں لینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس حلقے میں بعض دوسرے تصورات بھی موجود ہیں۔ مثلاً پروفیسر راجندر سنگھ جو آر۔ ایس۔ ایس کے سرسنگھ چالک رہ چکے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:

''ہمارا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ یہ لفظ ایک طریقہ عبادت نہیں بلکہ ایک ضابطہ حیات ہے۔''[۱۲]

اس گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہندتو کے علم بردار اس لفظ کی حقیقت اور اس کی تعریف کے مسئلے میں کس درجہ الجھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اس کو جغرافیائی اصطلاح مانتے ہیں تو اسکی حدود کی تعین مشکل ہو جاتی ہے اور پھر اس میں اس جغرافیائی خطے کی تمام اقوام شامل ہو جائیں گی، جو ان کی منشاء کے خلاف ہے۔ اگر اس لفظ کو مذہبی اصطلاح کے بطور استعمال کیا جاتا ہے تو متعدد مذاہب ہیں، جن کو یہ شامل کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہونا نہیں چاہتے۔ جیسے جین، بدھ، سکھ، لنگایت، قبائلی مذاہب، جیسے سنتھال اور بھیل، دراوڑ مذاہب، اور اگر اس کو ضابطۂ حیات (Way of Life) کے معنی میں لیتے ہیں تو پھر اس کا مصداق کوئی ایک متعینہ چیز قرار نہیں پاتی بلکہ ایک

دوسرے سے متصادم اور متضاد روایات کا مجموعہ بنتا ہے، جسے ایک ضابطۂ حیات کہنا درست نہیں ہوگا۔

تاریخ یا اسطورہ

لفظ ہندو کے بارے میں اس صورتحال سے بچنے کے لیے بعض افراد نے گریز کی راہ اختیار کی اور انہوں نے اس کے معنی کی تفہیم و تشریح کی کاوشوں کو رد تو نہیں کیا، بلکہ خود بھی تشریحات کیں لیکن ساتھ ہی قاری یا سامع کی نظر میں اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی اور لفظ ہندو اور ہندستان سے کچھ ایسے خیالی معنی وابستہ کر لیے، جو ان کی خواہش تو ہو سکتے تھے لیکن تاریخی حقائق نہیں۔ مثلاً گولوالکر کہتے ہیں کہ ''قدیم ہندستان انتہائی عظیم اور ترقی یافتہ ملک تھا۔ یہاں کا کلچر انتہائی متمدن اور یہاں کی روایات ترقی یافتہ تھیں۔ ساری دنیا پر ہندوستان کی حکمرانی تھی۔ دنیا کی تمام قومیں ہندستانی روایات کو اپنانا اپنے لیے باعث فخر سمجھتی تھیں۔ حتی کہ ان کی آخری خواہش یہ ہوتی تھی کہ ان کی زندگی کے آخری ایام گنگا کے کنارے گزریں۔ ہندستان کی حکومت ساری دنیا پر تھی لیکن یہ حکومت جبر کی حکومت نہیں تھی بلکہ امن و انصاف اخوت و مروت کی حکومت تھی۔ اس کے تحت غیر اقوام کی عزت، آبرو حتی کہ ان کی روایات پوری طرح محفوظ تھیں۔''[۱۳]

اس طرح کے خیالات سے اصل مسئلہ دب جاتا ہے اور خوابوں کی دنیا کی لذت میں حقیقی مسائل پس پشت چلے جاتے ہیں۔ ان تصورات کے ساتھ ہی اپنی موہوم عظمت پارینہ کے زوال کا سبب غیر ملکی حملہ آور یونانیوں، ہنوں اور مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے۔ یونانی ختم ہو گئے۔ ہن اسی ملک میں مدغم ہو گئے۔ صرف مسلمان بچتے ہیں، اس لیے نگاہ عتاب مسلمانوں پر پڑتی ہے۔

اس طرح تعریف کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے اور موہوم عظمت پارینہ کی بازیافت کے عنوان سے ایک منفی بلکہ مسلم مخالف احیاء پرستی کو فروغ ملتا ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے بعض فکری رہنماؤں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔[۱۴]

اب اس احیاء پرستی کا متعینہ رخ یہ ہو جاتا ہے کہ ہمارا قدیم نظام، جس کے تحت ہم ساری دنیا پر حاوی تھے دوبارہ رائج ہو۔ وہ لوگ جو ہماری اس مزعومہ تہذیب کے خاتمے کا سبب بنے ہیں، وہ ملک بدر ہو جائیں۔ ان کی تہذیب و ثقافت ختم ہو جائے۔ اس کے لیے ہر ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے حتی کہ اگر قوت کا استعمال کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔[۱۵]

باب دوم

ہندتو کے عناصر ترکیبی

اگر چہ ہندتو کی آواز کئی بااثر ہندو حلقوں سے بلند ہوئی۔ تاہم ساورکر کی آواز جسے بعد میں ہندو مہا سبھا اور آر۔ ایس۔ ایس کی سرپرستی حاصل ہوگئی، بحیثیت مجموعی سب سے زیادہ زوردار تھی۔ اس نے آر۔ ایس ۔ ایس اور اس کی ۲۵ ذیلی شاخوں کے ذریعے جدید ہندو معاشرے کی تخیل کی تشکیل وترتیب میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اگر چہ اس فکر کے حاملین اور آر۔ ایس۔ ایس کے فکری ترجمانوں نے بعض مشترک اہمیت کے مسائل پر ایک سے زائد آرا کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کے بارے میں ڈاکٹر ہیڈ گیوار کی رائے کچھ اور تھی اور ان کے جانشین گرو گولوالکر کی رائے کچھ اور۔ البتہ بنیادی مقصد ایک تھا۔ یعنی ہندستان کو ہندوؤں کے لیے خالص کرنا اور بیرونی عناصر سے پاک کرنا، چاہے زبان ہو یا تہذیب، مذہب ہو یا افراد جو بھی ہندی الاصل نہ ہوں[16] ان سب کو ملک بدر کرنا۔ اس مقصد کے لیے افہام وتفہیم سے لے کر زور زبردستی اور اسلحے کا استعمال سب کچھ کرنے کی اجازت ہے۔ ہندتو کے حامی جس ہندو راشٹر کا خواب دیکھتے ہیں اور جس نہج پر ملک کی تعمیر و تشکیل کرنا چاہتے ہیں، اس کے بنیادی خدوخال کیا ہیں، ذیل میں ہم ان کا جائزہ لیں گے۔

تصور خدا

ہندو مذہب کے جدید شارحین خدا کے قائل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی تشریح وتعبیر میں وہ باہم مختلف ہیں۔ کوئی وحدۃ الوجود کا قائل ہے۔ کوئی نراکاری ہے، کوئی نرگن وادی، کوئی

اوتارووادی ہے، کوئی اوتاروواد کے خلاف ہے، کوئی رام، کرشن کو بھگوان مانتا ہے، کوئی بھارت ماتا کو مانتا ہے، کوئی اپنے علاقے کے دیوتاؤں کو مانتا ہے، جیسے سکھوں میں گرونانک، سندھ میں بابالال بیراگی، مشرقی راجپوتانہ میں سائیں لال داس اور یوپی کے علاقوں میں کبیر داس وغیرہ پوجے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو گائے کو ہی بھگوان مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں گائے ہی ایشور ہے اور گائے ہی وید ہے اور گائے ہی گیان ہے۔[17]

لیکن آر۔ ایس۔ ایس کے فکری رہنما کسی مخصوص ذات یا مخصوص شخصیت کے خدا ہونے کے منکر ہیں۔ خدا کے تصور پر جو مباحث ہندو مذہب میں ہوتے ہیں ان کو وہ دور از کار اور فرسودہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نرگن اور نراکار کی بحث نتیجہ خیز نہیں ہے جبکہ ضرورت کسی زندہ خدا کی ہے اور وہ زندہ خدا ان کے نزدیک ہندو سماج ہے۔ لہذا پوجا یا ارچنا اسی کی ہونی چاہیے[18] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آر۔ ایس۔ ایس کی فکری رہنمائی کسی الہامی ہدایت یا آسمانی کتاب کے تابع نہیں۔ بلکہ انہوں نے محض اپنے زعم میں سماج کو الوہیت کے مقام پر رکھا ہے اور یہ فکر سراسر ہندو مذہب کے بنیادی تصورات سے متصادم ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ ہندو سماج سے مراد تو موجودہ ہندو سماج اور ہندو قوم ہی ہے لیکن اس کی خدمت یہ ہے کہ اس کو ترقی دے کر اس معیار پر پہنچایا جائے، جس پر یہ انادی کال میں تھا۔ دوسرے الفاظ میں ورن آشرم کو اختیار کرنا اور اسے نافذ العمل کرنا ہے، جس میں دھرم اختیاری نہیں بلکہ نسلی ہوتا ہے۔ آدمی جس طبقے میں پیدا ہوتا ہے اسی میں رہنا اور اسی سے متعلق کام کرنا ہی اس کا فریضہ ہوتا ہے، اور اس کا دائرہ کار صرف سماج کی سیوا کرنا ہی ہوتا ہے کسی مافوق الفطرت ہستی کی عبادت نہیں۔

گروگولوالکر کسی مافوق الفطرت خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ ہمارے پوروجوں نے کہا ہے کہ ہمارے لوگ ہی خدا ہیں۔[19] لیکن انہوں نے نہ تو اس جملے کا حوالہ نقل کیا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ ہمارے لوگ سے ان کی کیا مراد ہے یا یہ جملہ کن پوروجوں نے کہا تھا۔ آگے لکھتے ہیں: رام کرشن پرم ہنس نے کہا تھا کہ آدمی کی خدمت کرو لیکن آدمی کی تعریف میں تمام انسانیت آجاتی ہے۔ (جو گروجی کو مطلوب نہیں) اس لیے یہ ہوا کہ بہت سے لوگ جنہوں نے انسانیت کی خدمت کرنی چاہی ان کا خاتمہ بے عقلی اور بے عملی پر ہوا، اس لیے ہمارے پوروجوں نے انسانوں کی عقل اور دماغی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے کہا کہ

انسانیت کی اہمیت تسلیم، مگر اس سطح تک اٹھنے سے پہلے آدمی کو چاہیے کہ قادر مطلق کا تصور اپنے حدود کے اندر کرے، جس کو وہ سمجھ سکے۔ محسوس کر سکے اور اس کی خدمت کر سکے۔ اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ ہندو سماج وراٹ پُرش (انسان کامل) ہے اور وہی قادر مطلق کا مظہر ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ اگرچہ ہمارے پوروجوں نے لفظ ہندو استعمال نہیں کیا تھا۔ (جو گرو جی نے کیا ہے) لیکن ان کی مراد ہندو سماج ہی تھا۔ اس کی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ وراٹ پرش یا پرش سکتا کا جو تصور ویدوں میں ہے، اس کے مطابق وہ سماج وراٹ پرش ہے، جس میں برہمن سر ہے۔ راجہ ہاتھ ہے، ویشیہ ران ہے اور شودر پیر ہے اور یہ تقسیم صرف ہندو سماج میں ہے۔[۲۰]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہندتو کی اس فکر کا مطمح نظر ورن آشرم کی نشأۃ ثانیہ اور انسان کی نسلی تفریق کو از سر نو نافذ کرنا ہے۔ اس لیے اس کلچر کی ایک خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہاں حق نہیں بلکہ فرض اہم ہے۔ اور فرض وہ ہے جو نسلی ہے، مثلاً شودر کا فرض ہے اعلیٰ ذاتوں کی خدمت کرنا اور یہی چیز یہاں اتحاد و یکجہتی کی ضامن ہے۔ اس طرح فرض کا تصور غالب کر کے حقوق سے محروم کرنا بھی پیش نظر ہے۔

اس کلچر کا ایک امتیاز یہ بتایا جاتا ہے کہ یہاں ایکتا میں انیکتا (وحدت میں کثرت) ہے۔ یعنی حقیقت ایک ہے اور اس کے مختلف نام اور تصورات ہیں۔ ہر فرد کو آزادی ہے کہ جو جس طرح چاہے اس حقیقت کو پکارے۔ لیکن اس آزادی سے مذہبی رواداری قطعاً مراد نہیں ہے۔ بلکہ یہ فرد کی وہ آزادی ہے، جو ایک مکمل سماج کے کلی تسلط کو قبول کرنے کے بعد انفرادی طور پر کسی کو مل سکتی ہے۔ فرد اگر سماج میں ضم نہیں ہوتا ہے تو لامحالہ وہ ناقص ہے، اس کو ہر صورت میں سماج میں ضم ہونا پڑتا ہے۔ سماج میں ضم ہو کر وہ مکمل ہو جاتا ہے[۲۱] اب اگر اس سماج کے ایک فرد سے دوسرے فرد کے انفرادی تصورات مختلف ہیں، تو وہ ایکتا میں انیکتا ہے۔ چوں کہ وہ قادر مطلق کا مظہر ہے، اس لیے اس سماج کی پوجا فرض ہے۔ یہاں تک تو انسان روایات کا پابند ہے۔ لیکن وہ اس سماج کی پوجا کرنے میں آزاد ہے۔ چاہے جس نام سے پکارے چاہے سگن مانے، چاہے نرگن، دھرتی ماتا (بھارت ماتا) کی پوجا کرے یا گائے ماتا کی، رام کو پکارے یا نند کشور کو، یا سب کو پکارے یا کسی کو نہ پکارے یا ایک کو مانے دوسرے کو نہ مانے یا سب کا کلیۃً انکار کر دے۔ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے اگر وہ سماج کے طبقاتی نظام کو تسلیم کرتا ہے اور اپنی عملی زندگی میں اس طبقے واریت کو تسلیم کرتا ہے تو پھر باقی بات میں آزادی ہے اس فکر کے مطابق وہ تمام مذاہب جو ورن آشرم

اور ورات پرش کے عقیدے کو نہیں مانتے اس سماج سے خود بخود خارج ہو جاتے ہیں۔

اس کلچر کی ایک اہم خصوصیت چِت चित یا چتی चिति ہے۔ چت کے لفظی معنی ہیں دل میں آنا، خیال گزرنا، لیکن ہندو کلچر میں اس لفظ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ یہی لفظ ہے، جو ہندو سماج کو زمانے کے ساتھ چلاتا ہے۔

ہندتو کی اصطلاح میں چت کسی قوم کے اندرون میں موجود فطرت کو کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں ہندتو کے ایک اہم شارح پنڈت دین دیال اپادھیائے لکھتے ہیں: ''چت اصل ہے اور ابتدا سے قوم کے لیے مرکز رہی ہے۔ چت ہی اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ ثقافتی طور پر قوم کس سمت میں سفر کرے اور جو کچھ چت کے مطابق ہوتا ہے وہی دراصل ثقافت ہوتی ہے اور قوانین جو قوم کے چت کے جلوہ گر ہونے اور برقرار رکھنے میں مدد کرتے ہیں، اس قوم کا دھرم کہلاتے ہیں اس لیے یہی اعلیٰ دھرم ہے۔ دھرم قوم کی روح کا قالب ہے۔ اگر دھرم برباد کر دیا گیا تو قوم برباد ہو جاتی ہے، جو دھرم کو ترک کرتا ہے وہ قوم کے ساتھ دغا کرتا ہے۔[۲۲] یہاں دھرم سے مراد ورن آشرم کا دھرم ہے مذہب نہیں۔

چت

چت کا پرانا تصور ''ست چت آنند'' کی ان صفات ثلاثہ کا جز تھا، جن سے حقیقت علیا متصف تھی۔ دین دیال اپادھیائے نے اسے دوسرا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس کے ذریعے ورن آشرم (طبقاتی نظام) کی تائید کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بقول یہ ایسا تصور یا ایسی قوت ہے، جو کسی الہامی رہنمائی کی محتاج نہیں ہے، اس کا کام صرف ورن آشرم کی حفاظت کرنا ہے اور ورن آشرم اس فکر کا اتنا لازمی جز ہے کہ اس کو ترک کرنے والا باغی کہلاتا ہے اور اس نظام کا ٹوٹ جانا دراصل قوم کی موت کے مترادف ہے۔

ہندتو جس کلچر کی بات کرتا ہے ایک طرف اس کا دائرہ سرزمین ہند تک محدود ہے۔ دوسری طرف ان کی فکر یہ بھی دعویٰ کرتی ہے کہ ساری زمین ہندوؤں کی ہے، لیکن یہ دعویٰ بھارت ماتا کے تصور کے خلاف ہے۔ اس لیے فوراً ہی یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہندو سلطنت امریکا سے لے کر جاپان، چین، کمبوڈیا، ملایا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور شمال میں منگولیا اور سائبریا تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان سب کا ایک ہی کلچر تھا اور اس ہندو سلطنت کے ماتحت تمام اقوام نے اس کلچر کو اس حد تک قبول

کرلیا تھا کہ ان کی آخری خواہش یہ ہوتی تھی کہ ان کی موت گنگا کنارے پر واقع ہو[۲۳] گویا ساری دنیا پر ہندوؤں کی حکومت تھی۔ لیکن یہ سب ایسی خیالی باتیں ہیں جو تاریخی شواہد پر پوری اترتی ہیں اور نہ عقل و منطق ان کو جائز قرار دیتی ہے۔ آج دنیا میں متعدد قدیم ترین تہذیبوں کے آثار موجود ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس مزعومہ ہندو سلطنت کا تذکرہ یہ لوگ کرتے ہیں ان کا کوئی نام و نشان اور آثار و قرائن کہیں بھی دستیاب نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف تاریخی حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہندو امپائر نام کی کسی بھی چیز کا وجود نہ ہندستان میں کبھی رہا نہ بیرون ہند۔ ہندستان کے شمالی حصے میں آریوں کی حکومتیں تھیں، لیکن وہ چھوٹے رجواڑے تھے جنہیں سلطنت نہیں کہا جا سکتا۔

اسی طرح مختلف اقوام کی ثقافتی میراث بھی آج کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی حد تک موجود ہے۔ ان میں ہندستانی ثقافت کے اثرات بالکل نہیں ہیں اور نہ کسی تہذیب میں ورن آشرم کے اثرات کا پتا چلتا ہے، نہ ہی ہندستان کا نظامِ ثنویت کسی ملک میں رائج ہونے کے ثبوت ملتے ہیں اور نہ یہاں کی معاشرت کے اثرات کہیں نظر آتے ہیں۔ گولوالکر کی یہ خیالی باتیں محض قیاس آرائی یا ایسی خوش فہمی پر مبنی ہیں، جن کے لیے حقائق کی دنیا میں کوئی بنیاد نہیں۔ بلکہ ان کو ہر ذی علم اور صاحب بصیرت آدمی علم و فن کا مذاق اڑانے کے مترادف سمجھے گا۔

گرو گولوالکر کا یہ دعویٰ کہ ہندستان عہد قدیم میں ایک عظیم سلطنت کا مرکز تھا، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے بھی سند جواز حاصل کرنے میں ناکام ہے۔ ان میں بھی آریہ ورت کا تذکرہ ہے، جو صرف شمالی ہند کا ایک علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کی قومی روایات بتاتی ہیں کہ یہاں ہمیشہ آریہ دراوڑ مخاصمت رہی ہے اور آریوں نے دراوڑوں کو شکست دے کر شمالی ہند پر قبضہ کیا ہے۔ چنانچہ جنوب میں آج بھی دراوڑ قوم آباد ہے لیکن گرو جی اس آویزش کو مسلم عہد اور انگریزی عہد کا شاخسانہ بتاتے ہیں۔ آریہ دراوڑ مخاصمت اور آریہ مداخلت جیسے افکار کو وہ انگریزوں کی مزعومہ تھیوری قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آریہ باہر سے نہیں آئے بلکہ ہندستان کے اصل باشندے ہیں۔ اسی طرح آریہ دراوڑ مخاصمت یا آریہ تمل مخاصمت بھی فرضی طور پر انگریزوں نے پیدا کی ہے[۲۴] ہندستان کے تمام قدیم باشندے بشمول دراوڑ ہندو ہیں حتی کہ جین، آریہ سماجی، سکھ اور لنگایت وغیرہ جو اپنے ہندو ہونے کے منکر ہیں، وہ بھی ہندو ہیں۔[۲۵] تاہم گرو جی نے بدھوں کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔

مذہب

ہندتو کے علم بردار مذہب کے بارے میں اتنے حساس نہیں ہیں، جتنے کہ زبان کے بارے میں، یہ غالباً ان کی مجبوری بھی ہے۔ اس لیے کہ زبان کے معاملے میں وہ ایک حد تک قطعی بات کہہ سکتے ہیں، جب کہ مذہب کے بارے میں دوٹوک بات نہیں کہہ سکتے۔ مذہب کے بارے میں کوئی بھی دوٹوک بات ان کو ایک مخصوص خانہ میں محدود کردے گی، اور وہ جس طرح کی عمومیت چاہتے ہیں اور جن طبقات ونظریات کو شامل کرنا چاہتے ہیں، ان کو شامل نہیں کر پائیں گے۔

مذہب کے سلسلے میں ہندتو کی فکر مبہم رویہ اختیار کرتی ہے، کبھی مذہب کو الوہی تعلق کے معنی میں لیتی ہے اور کبھی مذہب کو دھرم کے معنی میں۔ تاہم غالب رجحان یہی ہے کہ مذہب دراصل دھرم ہے۔ اور دھرم کا مطلب ہے ''فرض''۔ یعنی انسان جس مخصوص طبقے سے تعلق رکھتا ہے، اس کے پیش نظر اس کا فرض کیا ہے؟ اس فکر کے مطابق اس کی اہمیت کیا ہے؟ اس کی تفصیل طبقاتی نظام کے ذیل میں آرہی ہے۔ تاہم مذہب کا یہ تصور ہر ایک کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اس لیے انہوں نے اس کی تشریحات مبہم انداز میں کی ہیں۔ کہیں الوہی تعلق کو شامل کیا، کہیں نظرانداز کردیا ہے، کہیں اس الوہی تعلق کی ایسی من چاہی تشریح کی ہے، جو نہ ویدوں کے مطابق ہے نہ ہندو روایات یا ہندی الاصل مذاہب کے مطابق۔ یہ متضاد فکری رجحانات کسی ایک متعینہ رخ کی نفی کرتے ہیں اور صرف اس اضطراب کا اظہار کرتے ہیں جو جدید ہندتو وادیوں میں پایا جاتا ہے۔ ذیل میں اس موضوع پر کچھ تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

ساورکر نے لکھا ہے:

> ''سوال اٹھتا ہے کہ ہندو دھرم کیا ہے؟ وہ کون سے بنیادی اصول وضوابط ہیں، جن کی پیروی ہندو کرتے ہیں۔ لیکن اس طریقے سے اس سوال کا جواب تلاش کرنا خود گمراہ ہوجانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ ہندو کوئی ہے ہی نہیں جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہندو دھرم سے مراد ہندو لوگوں کا مذہب ہے اور ہندو لفظ سندھو سے بنا ہے یعنی دریائے سندھ سے سمندر تک پھیلے ہوئے لوگوں کا مذہب، ہندو مذہب کا مطلب اس مذہب یا ان مذاہب سے ہے جو اس ملک اور اس قوم کے اپنے ہیں۔
> اگر ان مختلف مذہبی اصولوں اور اخلاقیات میں کوئی یکسانی دکھائی نہیں دیتی تو یہی کہنا

ہوگا کہ ہندو مذہب عام معنوں میں مذہب نہیں ہے بلکہ ایسے مختلف مذاہب اور فرقوں کا مجموعہ ہے، جو ایک دوسرے سے الگ ہی نہیں متضاد بھی ہیں"۔[۲۶]

ایک اور موقع پر وہ لکھتے ہیں:

"ہندتو کے ثقافتی پہلو پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں مل سکتا، لیکن ہندتو اور ہندو دھرم دونوں کو ایک ہی مان لینے کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ ہندو دھرم کو سناتن دھرم کہنا بھی درست نہیں اور ہندتو اور ہندو دھرم کو ایک مان لینا بھی غلط ہے اور اس بھول کا نتیجہ سامنے آرہا ہے کہ جو فرقے سناتن دھرمی نہیں ہیں ان کے دل میں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔"[۲۷]

ہندتو کے شارح کی حیثیت سے ساورکر کا بیان بالکل درست ہے۔ ان کے پیش نظر ہندتو کا کوئی مذہبی تصور نہیں تھا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہندتو اصلاً مذہبی تحریک نہیں ہے۔ بلکہ ایک خالص سیاسی تحریک ہے۔ اس نے مذہب کی بھی ایسی سیاسی تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے جو ہندو مذہب کے قدیم تصور سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس تصور کے بانی ساورکر کے سامنے ہندتو کا جو نقشہ ہے، اس میں تمام ہندی الاصل مذاہب شامل ہیں حتی کہ وہ بدھ مذہب کو بھی اس میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب ہندستان میں جو نئے مذاہب پیدا ہو رہے ہیں یا ہوں گے مثلاً سائیں بابا کا مذہب، آچاریہ رجنیش کا مذہب یا عہد وسطی کے بابا لال بیراگی (سندھ) اور سائیں لال داس (راجستھان) کا مذہب، ان کو بھی اسی کے دائرے میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن لفظ ہندتو نے ایک غلط فہمی پیدا کر کے بہت سے فرقے اور مذاہب کو اس سے بددل کر دیا چونکہ بہ ظاہر لفظ ہندتو ہندو محسوس ہوتا ہے اور ہندو دھرم و سناتن دھرم مترادف الفاظ (اگر چہ یہ حقیقت نہیں ہے صرف عوام میں اس کا استعمال ہے) سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے غیر ہندو فرقوں مثلاً جین، بدھ، سکھ وغیرہ نے اس کو اپنے خلاف سمجھا اور جو فرقے اپنی شناخت ویدک عہد سے کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اس کو غلط قرار دیا۔ مثلاً آریہ سماج وغیرہ۔

اس کے بعد ہندتو کے علم برداروں نے ہندوازم کو ہندو مذہب کی بجائے ہندو تہذیب کہنا شروع کیا مثلاً گری لال جین نے لکھا ہے۔ "ہندوازم ایک تہذیب ہے جو ہندو قومیت کی بنیاد ہے۔"[۲۸] اس کے اثرات اس حد تک مرتب ہوئے کہ آریہ سماجی حضرات نے بھی اپنے ہندو کہلائے جانے پر اعتراض نہیں کیا۔

سوامی وویکانند نے ایک جگہ ہندوازم کو مذہب کہا ہے[29] لیکن اس کی تشریح ایک دوسرے مقام پراس طرح کی ہے کہ ہندو مذہب کی حقیقت خارجی یا الوہی عوامل میں نہیں بلکہ انسان کے اندرون میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''انسان کے اندر ایک قوت کارفرما ہے، جواس کو کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیتی ہے اور کچھ سے باز رکھتی ہے۔ یہی مذہب ہے۔ ''[30] گویا سوامی جی کی نظر میں بھی مذہب کسی مافوق الفطرت یا الوہی (Divine) ہستی کی رہنمائی کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کے اندرون سے ابھرنے والی ایک قوت ہی مذہب کو تشکیل دیتی ہے۔[31] اس طرح مذہب ایک فکری چیز بن جاتا ہے، جسے انسان اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق خود وضع کرسکتا ہے اور اپنے حالات وظروف کی معاونت سے اسے دوسروں پر بھی مسلط کرسکتا ہے۔ گری لال جین کے مطابق پیغمبرانہ عنصر یا خدائی ہدایت (Divine guidance) ہندو دھرم کے خلاف ہے۔[32] ہندو مذہب میں ''آخری پیغام'' کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ویدوں کے بعد اپنشد تصنیف ہوئے اور اپنشد کے بعد مہا کاویہ اور پران لکھے گئے۔ یہاں کوئی چیز آخری نہیں ہے[33] گری لال جین اس کو ہندو دھرم کی خوبیوں میں شمار کرتے ہیں اور ان کا عندیہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہا کاویہ اور پرانوں کے بعد بھی ویدوں کے درجے کی مذہبی تصانیف معرض وجود میں آسکتی ہیں۔

جدید ہندو تحریکات پر غیر مذہبیت کا غلبہ بہت زیادہ رہا ہے۔ چنانچہ سوامی وویکانند جو رام کرشن مشن کے اہم نمائندے اور ہندو دھرم کے جدید مصلحین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، الوہی مذہب (Divine) کی جگہ محض بھارت ماتا اور ''ہمارے پوروجوں'' کو ہی قابل پرستش سمجھتے ہیں ان کی نظر میں بھی معبود اعلیٰ (Supreme God) آباء واجداد ہیں اور باقی دیوی دیوتا بے کار اور ترک کردینے کے قابل ہیں۔[34] گری لال جین نے سوامی جی کے اس مذہب کو حب الوطنی کا مذہب (Religion of Petriiotism) کہا ہے۔[35] آج کے ہندتو پر یہی حب الوطنی کا مذہب غالب ہے۔ یہ مذہب ایک ایسے خدا کو مانتا ہے، جس کا کوئی تذکرہ قدیم مذہبی کتابوں میں نہیں ہے۔ ہندو سماج یا بھارت ماتا، اس مذہب کے مطابق موکش اور نروان، یہی ہے کہ بھارت ماتا اور بھارت میں آباد ہندو سماج کی سیوا کی جائے۔ یہی یہاں کی عبادت ہے۔ گولوالکر نے کسی بھی قسم کی مذہبی عبادت اور پوجا پاٹ کو اپنے دائرے سے خارج کردیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''لوگ مندر میں جاتے ہیں اور بت کو خدا کا نشان سمجھ کر پوجتے ہیں۔ ان کی اپاسنا کرتے ہیں۔ لیکن یہ پوجا پاٹ کسی باعمل شخص (کرم یوگی)[36] کو مطمئن نہیں کرسکتی ہم تو زندہ خدا

چاہتے ہیں۔ ایسے خدا کا کیا کام جو صرف سنتا ہو اور جواب نہ دیتا ہو۔ یہ بت نہ روتے ہیں، نہ سنتے ہیں اور نہ کسی بھی قسم کے رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ''[۳۷] لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ زندہ خدا کہاں ہے؟ گرو جی اس کا جواب دیتے ہیں کہ وہ ہندو سماج ہے۔[۳۸]

قدیم مذہبی کتابوں میں دھرتی ماتا کا تصور تو پایا جاتا ہے لیکن دھرتی ماتا کو اس مخصوص خطے ہندستان کے معنی میں لینا، اس کو بھارت ماتا کہنا اور ایک دیوی کی شکل میں اس کی علامت متعین کرنا اس گروہ کی اپنی اختراع ہے۔ اس کا اصل ہندو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بنکم چندر چٹرجی نے اپنے ناول آنند مٹھ میں بھی بھارت ماتا کا تصور دیا ہے۔ لیکن بھارت ماتا کو مجسم دیوی کی شکل دینے والے افراد نے یہ تجسیم اپنی حسب خواہش کی ہے، شمالی ہند میں اسے ایک دوسری دیوی کی شکل میں دکھایا گیا ہے جب کہ بنکم چندر نے کالی مائی جو بنگال کی علاقائی دیوی کے روپ میں بھارت ماتا کی بھی تجسیم کی ہے۔

بھارت کے ماتا ہونے کا یہ تصور بنکم چندر کی نظر میں تمام رشتوں، ناتوں، جذباتی لگاؤ اور فطرت کے تقاضوں سے بلند ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بھوانند نے کہا ہم لوگ دوسری کسی ماں کو نہیں مانتے، ہماری ماتا جنم بھومی ہی ہماری جننی (پیدا کرنے والی) ہے۔ ہمارے نہ ماں ہے نہ پتا، نہ بھائی ہے، نہ کچھ اور استری (بیوی) بھی نہیں۔ گھر بھی نہیں مکان بھی نہیں۔[۳۹]

بھارت ماتا کا یہ تصور ہر اعتبار سے ناقص ہے خود اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور عام لوگوں کے لیے بالکل نیا تھا۔ جب بھوانند نے ''وندے ماترم'' گایا تو مہیندر نے یہی اعتراض کیا تھا کہ تم تو دیش کی تعریف کر رہے ہو، یہ تو ماں نہیں ہے۔[۴۰]

دوسری بات یہ ہے کہ جنم بھومی کی جغرافیائی حیثیت ناقابل بیان ہے۔ چونکہ جنم بھومی سے کیا مراد ہے یہ واضح نہیں۔ وہ مخصوص مکان جہاں کسی کا جنم ہوتا ہے یا وہ مخصوص گاؤں یا شہر، یا وہ مخصوص علاقہ۔ یہ بالکل واضح نہیں۔ اگر موجودہ ہندستان کو بھارت ماتا مانا جائے تو اس کی عمر ابھی صرف پچاس سال ہے۔ گویا پچاس سال قبل بھارت ماتا دوسری تھی اب دوسری ہے۔

گولوالکر نے وطنیت کی الوہیت کے اس تصور کو ایک جگہ اس اسلوب میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''شاستروں کے مطابق انسان پر تین طرح کے قرض ہوتے ہیں۔ ۱۔ خدا کا قرض ۲۔

بزرگوں (آباواجداد) کا قرض ۳۔ رشیوں کا قرض۔ انسان پر ان تینوں قرضوں کی ادائی گی ضروری ہے، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان قرضوں کی ادائی کیسے کی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا سماج زندہ خدا ہے۔ اس لیے اس کی پوجا اور اپاسنا خدا کے قرض کی ادائی گی ہے۔ (یعنی خدا کا قرض خدا کی عبادت سے ادا نہیں ہوگا بلکہ سماج کی خدمت سے ہوگا۔) اور یہ دھرتی ہمارے پرکھوں کی جنم بھومی ہے۔ اس کی خدمت پرکھوں کے قرض کی ادائی گی ہے، اور رشیوں، منیوں نے اس دھرتی کو اپنے ہون اور تیاگ سے مقدس کیا ہے۔ اس لیے اس کی پوجا رشیوں کے قرض کی ادائی گی ہے۔'' [۴۱]

ایک بات گوروجی نے بغیر حوالے کے کہی ہے وہ یہ کہ ہمارے لوگ اور ہمارا سماج ہی خدا ہے۔[۴۲] ان کے بقول ہندو سماج دراصل قادر مطلق (Almighty) کا مظہر ہے۔[۴۳] اس مفہوم میں انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندو احیا پرست اصحاب قلم کی اور بھی متعدد شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں، ان میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندو قوم یا ہندو سماج یا سرزمین ہند قابلِ پرستش یا خدا ہے۔ سوامی وویکانند ایسا ذی علم بھی سرزمین ہند کی اس الوہی (Divine) حیثیت کا قائل ہے۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ یا خدا کا یہ تصور ویدک تصور نہیں۔ ویدک عہد میں وطن کو یا بھارت ورش کو کبھی خدا نہیں کہا گیا اور نہ آج تک ہندو روایات میں کبھی وطن یا سماج کو خدا کا مقام حاصل ہے۔ ہندو دھرم میں وطن یا سماج کی پرستش کبھی نہیں ہوئی۔ خدا کے وجود کی مختلف اقسام کا تو تصور رہا ہے۔ کسی نے اس کو ساکار کسی نے نراکار، کسی نے سگن کسی نے نرگن اور کسی نے شونیہ کہا۔ لیکن خدا کا ایک الوہی (Divine) اور مافوق الفطری تصور رہا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ آج ہندو سماج میں سماج یا وطن کو خدا کے روپ میں قبول کر لیا گیا ہو، آج بھی فکری سطح پر وہی مباحث ہیں جو قدیم عہد میں تھے اور عملی سطح پر ایک قادر مطلق ہستی یا تین عظیم مافوق الفطرت ہستیوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہندو رام اور کرشن کو خدا کا اوتار سمجھ کر پوجتے ہیں۔ ہولی پر ہلاد کی یاد میں مناتے ہیں۔ آج بھی مندر میں ایشور کی مہما گائی جاتی ہے نہ کہ ہندو سماج کی، اس لیے یہ فکر واضح طور پر ہندو مذہب کے خلاف ہے۔ اس کو نہ تو ویدوں کی حمایت حاصل ہے اور نہ اپنشدوں کی اور نہ پرانوں کی حتیٰ کہ موجودہ ہندو روایات بھی سراسر اس کے خلاف ہیں۔

دراصل ہندتو کے علم بردار اخلاق کی بنیادیں تو انسان کے اندرون میں تسلیم کرتے ہیں

لیکن مذہب کی کوئی علیحدہ بنیاد تسلیم نہیں کرتے۔ حیرت ہے کہ اس کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ یہ ان کی ناکامی ہے کہ وہ خدا کا کوئی ایسا تصور پیش نہیں کر سکے جو معقول بھی ہو اور موثر بھی۔ شرک نامعقول تصور ہے اور اپنشد میں جو خدا کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ بے معنی اور غیر موثر ہے، جو انسانی زندگی کی تشکیل میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا، جس کے مطابق ہر چیز جو ہے اور ہو رہی ہے جائز اور صحیح ہے پھر اس طبقے کے دور جدید کے لیڈر بھی خدا کا کوئی معقول اور موثر تصور پیش کرنے سے عاجز رہے ہیں۔ اس لیے ان حضرات نے اب ملک و قوم یا سماج کو خدا کے مقام پر فائز کر دیا ہے جو مذہب کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ اس لیے کہ وطن یا سماج نہ حاضر و ناظر ہو سکتے ہیں، نہ محاسب ہی بن سکتے ہیں اور نہ قابل عبادت یا قابل پرستش ہی بن سکتے ہیں۔

یہ تصور صرف ایک سیاسی تصور ہے۔ اس کا اصل مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ قوم کو مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے ایک سیاسی وحدت میں پرونے کی کوشش ہے۔ چونکہ ہندو دھرم میں مذہب کا کوئی ایک مخصوص و متعین تصور نہیں ہے، اس لیے یہ طبقہ اس کو بڑی آسانی سے مذہبی رنگ دینے میں کامیاب بھی رہا ہے ورنہ اصل کے اعتبار سے یہ سیاسی تصور ہے جو اپنے فاشسٹ خیالات اور نازی تصورات کو نافذ کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

ہندو دھرم میں ایشور کی پوجا اور اپاسنا کسی خاص ذاتی مقصد کے لیے کی جاتی ہے۔ چاہے یہ مقصد موکش حاصل کرنا ہو یا اگلے جنم میں اچھا مقام پانا یا اور کچھ ہو لیکن بہر حال اس میں عمل اور جزا کا تصور موجود ہے اور وہی عبادت اور پوجا کا محرک ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے محرکات میں استمداد، تعوذ اور ولایت وغیرہ کا حصول ہے۔

لیکن اس جدید تصور کے اندر مقصدیت کا فقدان ہے۔ اس میں یہ دعویٰ تو کیا جاتا ہے کہ ہندو سماج کی خدمت، خدا کی عبادت ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس پوجا کرنے والے کو کیا حاصل ہوگا؟ اس سے دنیا یا آخرت میں کیا اجر ملے گا؟ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کا اس پوجا یا ارچنا سے کیا تعلق ہے؟ کامیاب انسان کس کو کہیں گے؟ انسان کی انفرادی شخصیت کا کیا تصور ہے، انفرادی وحدت کے کوئی معنی ہیں یا نہیں؟ یا انسان کی انفرادیت کا سماج سے کیا رشتہ ہے؟ وغیرہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب سے اس فکر کا دامن تہی ہے۔

اس تصور کے اندر جس طرح مقصدیت کا فقدان ہے اسی طرح سمت سفر کا بھی فقدان ہے۔ انسان کی بظاہر کوئی منزل نہیں، کوئی غایت نہیں۔ ہندو سماج کی عبادت کا تصور تو ہے لیکن اس

کی عبادت کس طرح کی جائے؟ سماج کوئی مورتی یا علامت تو بن نہیں سکتی، جس کو سجدہ کر لیا جائے۔اس لیے سماج کی خدمت کا کوئی تصور ہونا چاہیے۔لیکن ان کے پاس کوئی تصور نہیں ہے۔ اگر ہے تو یہ ہے جیسا کہ گولوالکر اور ہیڈ گیوار دونوں نے کہا ہے کہ ہندو سماج کو سب سے زیادہ طاقتور بنانا ہی ہندو سماج کی خدمت ہے۔[۴۴] اور اس سماج کو خارجی عناصر سے پاک کرنا ہی اس کی خدمت ہے۔[۴۵] اس بے سمت سفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس فکر سے متاثر ہندو خاص طور پر نوجوان طبقے کی اخلاقی و مذہبی حالت دیوالیہ ہوگئی۔اس نے یہ سمجھا کہ دوسروں کو زور زبردستی سے ہندو بنانا ہی واحد کار خیر ہے۔اس لیے ہندو مذہب کو زبردستی نافذ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔آج اس کے مظاہرے ہندستان کے مختلف علاقوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس تحریک نے نوجوان نسل کے ایک طبقے کو اخلاقی اقدار سے اس قدر محروم کر دیا ہے کہ لوگ دوسروں کی تذلیل کرنے، عورتوں کے ناموس کو تاراج کرنے اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنے حتی کہ بے گناہ انسانوں کو زندہ جلا دینے جیسی وحشیانہ حرکتوں کو بھی مذہبی خدمت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔یہ اس سفر بے سمت کے ابتدائی نتائج ہیں۔اگر ہندو مذہب کے ماننے والوں نے اس خطرے کا احساس نہیں کیا اور اس پر قدغن عائد نہیں کی گئی تو وحشت و بربریت کا یہ دیو استبداد ظلم و ستم کی نہ معلوم کتنی لرزہ خیز داستانیں رقم کرے گا۔

مذہب کے اس تصور نے کہ سماج ہی خدا ہے خود مذہب کے لیے ایک خطرناک صورت حال پیدا کر دیا ہے۔اگر یہ تصور عام ہوتا ہے تو ہندو مذہب جو ویدک لٹریچر پر مبنی ہے لامحالہ شکست و ریخت سے دوچار ہوگا۔

مذہب کا یہ مادی تصور اپنے اندر فی نفسہ ایسی کشش یا قوت تحریک نہیں رکھتا، جو ایک پورے سماج کو اپنے گرد جمع کر سکے۔ انسان اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے ایک مافوق الفطرت ہستی چاہتا ہے۔سماج یا نسل اس کی اس تلاش کی منزل نہیں بن سکتے۔اس نظریے کو بھی قبول عام حاصل ہونے کی توقعات نہیں تھیں۔اس لیے اس کے حامیوں نے اس کے گرد اساطیر کا ایک جال بُنا ہے۔مثلاً کہتے ہیں کہ یہ دھرتی دیوتاؤں کی بسائی ہوئی ہے۔اس لیے ہم لوگ عام انسان نہیں ہیں۔بلکہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں اور بیٹا وہی ہوتا ہے جو باپ ہوتا ہے۔[۴۶] یعنی ہم چونکہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں اس لیے خود بھی دیوتا ہیں۔یا مثلاً یہ دھرتی مقدس ہے اور اس پر جنم لینا خوش نصیبی ہے اور اس سرزمین پر پیدا ہونے والا بھی مقدس ہو جاتا ہے۔[۴۷]

اس دھرتی کی تقدیس یا اس سماج کی عظمت کا تصور موجودہ ہندتو کا سب سے غالب عنصر ہے، گولوالکر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہمارے آبا و اجداد کا کامل یقین تھا کہ یہ سرزمین تمام زمینوں میں مقدس ہے۔ یہاں پر نیک کام کا سو گنا پھل ملتا ہے۔ سوامی وویکانند نے کہا تھا کہ اگر دنیا میں کوئی زمین مقدس ہے اور خدا کی طرف جانے والی ہر روح کا گزر وہاں سے ہوتا ہے تاکہ وہ اپنا گھر پا سکے تو وہ سرزمین بھارت ہے۔[۴۸] تقدیس ہند کا یہ تصور آخر کن بنیادوں پر استوار ہے اور یہ سرزمین باقی دنیا کے مقابلے میں کیوں مقدس ہے۔ اس سرزمین پر جنم لینے سے انسان کیوں مقدس ہو جاتا ہے، اور اگر یہاں جنم لینے والا انسان بے عمل ہو تو کیا وہ بھی مقدس مانا جائے گا۔ اسی طرح اس سرزمین پر پیدا ہونے والے وہ لوگ جو ہندتو کی تعریف کے مطابق اس مذہب کے ماننے والے نہیں ہیں وہ کیوں مقدس نہیں ہیں۔ اور اسی سرزمین کا وہ حصہ اور سماج جو آج پاکستان یا بنگلہ دیش کہلاتا ہے وہ کیا ہے؟ اسی طرح کے بے شمار سوالات ہیں، جن کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ اب اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض نسلی برتری کا شاخسانہ ہے۔ یہ گروہ اپنے آپ کو باقی دنیا سے افضل مانتا ہے بلکہ ازلی ابدی یعنی الوہی صفات کا حامل ماننا اور اس دھرتی کی بھی تقدیس کا قائل ہے جس پر یہ آباد ہے۔

تقدیس ہند کا یہ مفروضہ بھی شاید زیادہ کارآمد نہیں تھا اس لیے کچھ مادی اور موہوم تصورات پیش کیے گئے مثلاً کہا گیا کہ انادی کال (ازل[۴۹]) سے ہندستان کی عظیم ترین تہذیب تھی اور سارے عالم پر ہندوؤں کی ہی حکومت تھی۔ زبانوں میں سب سے افضل سنسکرت تھی۔ قدیم عہد میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سماج ہندو سماج تھا۔ ساری دنیا ان کی عظمت کے گن گاتی تھی لیکن غیر ملکی حملہ آور جن کی ابتدا اسکندر[۵۰] سے ہوتی ہے۔ انہوں نے یہاں کی تہذیب و تمدن کو ختم کر کے یہاں کی عظمتوں کو پارہ پارہ کر دیا اور پھر مسلمان حملہ آوروں نے اس ملک کو اپنا غلام بنا لیا۔ اس طرح ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک ہندستان کی عظمتوں کا سورج گہنایا رہا۔ اس عہد کو سنگھرش کا عہد کہتے ہیں۔ اس دور میں جو جنگیں یا مقابلہ آرائیاں ہوئیں، ان کو عظمت رفتہ کی بازیافت کی کوشش قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں رانا پرتاپ اور شواجی ہندو ثقافت کو دوبارہ عروج بخشنے کے لیے میدان کارزار میں آئے[۵۱] وہ اس کا انکار بھی نہیں کرتے کہ ہندوؤں نے مسلمان حکمرانوں کے درباروں میں عہدے حاصل کیے لیکن وہ اس کو ان کی بزدلی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً راجہ مان سنگھ کے بارے میں گولوالکر نے لکھا ہے کہ ''ذہنی غلامی ایسی بیماری ہے کہ راجہ مان سنگھ جیسا

آدمی جو اپنی قوت بازو سے مغل سلطنت جیسی کئی سلطنتوں کو ختم کرسکتا تھا اکبر کا درباری بن کر رہ گیا جبکہ شیواجی نے مغل سلطنت کو پارہ پارہ کردیا۔"[۵۲]

طبقاتی نظام:

ویدک عہد میں ہندستان کے اندر طبقاتی نظام رائج تھا۔ اس نظام کی اساس اس پر تھی کہ ایک طبقہ برہما کے منہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے سب سے اعلی وارفع ہے۔ اس کا کام علم کی خدمت کرنا ہے۔ اس کے حقوق واختیارات سب سے زیادہ ہیں۔ دوسرا طبقہ برہما کے بازوؤں سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے یہ پہلے طبقہ سے کم تر ہے۔ اس کا کام ملک کا نظام چلانا ہے اور اس کے اپنے حقوق وفرائض ہیں۔ تیسرا طبقہ برہما کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے یہ طبقہ پہلے دو طبقوں سے کم تر ہے۔ اس کا کام تجارت ہے اور اس کے اپنے حقوق وفرائض ہیں۔ چوتھا طبقہ برہما کے پیروں سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے یہ طبقہ پہلے تینوں طبقوں سے کم تر ہے اس کا کام سابقہ تینوں طبقات کی خدمت ہے۔ اس کے حقوق نہیں ہیں۔ عام انسانی حقوق جیسے حق ملکیت حصول علم کا حق اور دوسرے انسانی حقوق ان کو حاصل نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے حصول کی کوشش ان کے لیے سنگین جرم ہے جس کی سزا بسا اوقات موت بھی ہوسکتی ہے۔[۵۳] اس آخری طبقے میں بھی دو طبقے ہیں ایک چھوت دوسرا اچھوت۔ اچھوت طبقے کا کسی کو چھونا بلکہ اس کے سایہ کا کسی پر پڑ جانا بھی اس کا جرم شمار کیا جاتا ہے اور اس پر اس کو سخت سزا دی جاتی ہے۔ اس لیے اچھوتوں کے مکانات آبادیوں کے باہر ہوتے ہیں، اور قدیم عہد میں وہ راستے کے صرف ایک طرف چلتے تھے اور لکڑی بجاتے ہوئے یا اچھوت اچھوت کہتے ہوئے چلتے تھے۔

اس نظام کی صحت پر سب سے پہلے مہاویر جین اس کے بعد گوتم بدھ نے سوالیہ نشان لگایا اور انسانی مساوات کی بات کہی۔ چونکہ یہ دونوں چھتری خاندان کے تھے اور چھتریوں میں برہمن قوم کے خلاف عام بیزاری کا رجحان پیدا ہو چکا تھا، اس لیے ان افکار خصوصاً گوتم بدھ کے خیالات کو زبردست قبولیت حاصل ہوئی اور مہاتما بدھ کی حیات ہی میں ان کا مذہب آریہ ورت (شمالی ہند) کا غالب مذہب بن گیا۔ اگرچہ اس وقت کے سماج نے بدھ مذہب کو اختیار کرلیا تھا لیکن اس کے اسباب میں ایک اہم سبب برہمن بیزاری تھا نہ کہ سماجی مساوات۔ اس لیے یہ تصور یہاں پورے طور پر مقبول نہ ہوسکا اور جب برہمنوں کو دوبارہ عروج حاصل ہوا تو یہاں کے سماج نے بہت جلد بودھ مت کو ترک کردیا۔

اسلام تقویٰ، پرہیز گاری اور خدا ترسی کو فضیلت کا معیار قرار دیتا ہے اس کی تعلیمات نے بدھ مت کے پیرو کاروں کو زیادہ متاثر کیا اور انہوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کرلیا، اسلام کی تعلیمات کے زیر اثر سماجی عدم مساوات کے اس تصور میں نمایاں کمی آئی اور اس کے عملی مظاہر تقریباً ختم ہونے لگے۔

سماجی عدم مساوات کا یہ نظام آج ختم ہو رہا ہے۔ رنگ و نسل کی بنیاد پر شرف و برتری کے اصول کو ساری دنیا نے ٹھکرا دیا ہے۔ اس قسم کا دعویٰ قرون مظلمہ کی طرف رجعت قہقری کے مترادف سمجھا جاتا ہے لیکن برہمن قوم میں ابھی تک یہ تصور موجود ہے۔

جدید ہندتو کی فکر اس طبقاتی نظام' جس کو اصطلاح میں ورن آشرم کہا جاتا ہے کی مؤید ہے، وہ اس نظام کو عملی قرار دیتے ہیں اور اس کے خاتمے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ گرو گولوالکر بھی اس نظام کو عملی بتاتے ہیں' ان کا خیال ہے کہ ترقی یافتہ سماج مختلف امور کی انجام دہی کے لیے مختلف طبقات وضع کرتا ہے۔ قدیم سماجی نظام ایسا ہی تھا۔ اس میں ہر طبقے کی ترقی کے لیے فطری مواقع تھے۔[۵۴]

ایک موقع پر گولوالکر نے اس طبقاتی نظام کو ہندو معاشرے کے بنیادی تشخصات Distingushing features میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ورن آشرم ہمارے معاشرے کا تشخص ہے۔[۵۵]

گولوالکر نے غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ہندو سماج میں عدم مساوات کا نفوذ انگریزوں کی (Divide and Rule) کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔[۵۶] انگریزوں نے ہندوؤں کے درمیان اونچ نیچ کے تصور کے ذریعہ تفریق پیدا کر کے یہاں حکومت کی۔ حقائق سے چشم پوشی کی ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ اگر گرو جی ذرا بھی غور کرتے تو انگریزوں کی آمد سے ہزاروں سال پہلے کی مذہبی کتابوں میں اونچ نیچ اور اس کی بنیاد پر ہونے والے بے تحاشا مظالم کی داستانوں سے صرف نظر نہ کر پاتے۔ اس کے متعدد قدیم دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ ہندو معاشرے میں اچھوت طبقات کے ساتھ کس طرح کا ظالمانہ اور جابرانہ رویہ اختیار کیا جاتا تھا، کس طرح ان کی جان' مال اور عزت و آبرو خطرے میں تھی اور ان کا وجود غیر محفوظ تھا۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب منوسمرتی میں ان سزاؤں کا تذکرہ ہے، جو اچھوتوں کو مختلف

جرائم پر دی جاتی تھیں۔ مثلاً اگر کوئی اچھوت کسی بڑی ذات والے کو چھولے تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا یا کسی اچھوت کے کان میں وید کا کوئی لفظ پڑ جائے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا تھا۔ وغیرہ۔

چینی سیاح فاہیان اور ہوین سانگ نے بھی ان سزاؤں اور اس برتاؤ کا ذکر کیا ہے جو ہندو اچھوتوں کے ساتھ محض اس بنیاد پر روار کھتے تھے کہ وہ نچلی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

صدیوں تک یہ مظالم ہندستان کے شمالی علاقوں میں چھوٹی ذاتوں پر کیئے جاتے رہے۔ لیکن گرو جی نے اپنے تخیلات کی دنیا میں ایک ایسا ہندستان تشکیل کر رکھا ہے، جس کا وجود عالم امکان میں کبھی نہیں تھا اس لیے ان کو یہ سب مظالم نظر نہیں آتے۔

گرو جی اس نظام کو ان اہم ستونوں میں سے مانتے ہیں جو ہندو دھرم کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ورن آشرم واحد نظام ہے، جس نے صدیوں تک ہندو دھرم کی حفاظت کی ہے اور جہاں جہاں یہ نظام ٹوٹا وہاں اسلام پھیل گیا مثلاً بنگال میں بدھ مذہب کے زیر اثر یہ نظام ٹوٹ چکا تھا اس لیے وہاں بڑی آسانی سے اسلام پھیل گیا، حالانکہ بنگال مسلمانوں کے صدر مقام دہلی سے دور تھا اور شمالی ہند خاص طور پر دہلی اور اتر پردیش کا علاقہ جہاں یہ نظام سختی کے ساتھ موجود تھا، وہاں بدستور ہندو اکثریتی علاقہ برقرار رہا۔[۵۷] وہاں تبدیلی مذہب برائے نام ہی ہوئی۔

طبقاتی نظام تبدیلی مذہب میں ایک رکاوٹ ہے، اس کی دلیل دیتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ایران، مصر اور روم وغیرہ عظیم سلطنتوں میں ورن آشرم نہیں تھا اس لیے وہ مسلمانوں کے زیر نگیں آنے کے بعد وہاں پوری پوری قومیں مسلمان ہو گئیں۔[۵۸] گرو جی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر وہاں بھی طبقاتی نظام ہوتا تو شاید اسلام وہاں کا غالب مذہب نہ بن سکتا۔ گرو جی کے اس استدلال سے ایک بات یہ ثابت ہوگئی کہ ورن آشرم ایک جبری نظام ہے، جو فرد سے اس کی آزادی سلب کر کے اس کو طبقہ بندی کے حصار میں محصور رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ نظام مذہبی آزادی بھی عطا نہیں کرتا۔

ورن آشرم محض تقسیم کار کا نظام بنا کر پیش کرنے کی کوشش اور بھی ہندو حلقوں نے کی ہے۔ مثلاً دور جدید کے اہم مفکر آربندو گھوش نے لکھا ہے: ''اصلاً یہ نظام نہ صرف معاشیات کو منظم کرنے کے لیے تھا بلکہ فرد کی علمی، اخلاقی اور روحانی ارتقاء کے لیے بھی ضروری تھا اور اس کام کے لیے اس کو تشکیل دیا گیا تھا۔''[۵۹] دراصل یہ سب تاویلات ہیں۔ ورنہ ہندو معاشرے میں نام نہاد

چھوٹی اقوام کو باعزت طور پر جینے کا حق نہیں ہے اور اگر کوئی اس طرح کا حق دینے کی کوشش کرے تو اس کو غدار اور ملک وقوم کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ قدیم عہد میں مہاتما بدھ نے اس کی کوشش کی تھی تو آج تک یہ طبقہ ان کو معاف نہیں کر سکا۔ ساورکر نے اشوک کے بدھ دھرم اختیار کرنے کو آراشٹریتا اور دھرم سنکٹ جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔[۶۰] اور ویدک دھرم کے ماننے والوں پر اشوک نے کس طرح مظالم ڈھا کر ان کا مذہب تبدیل کروایا تھا، اس کی تفصیل حوالوں کے بغیر بیان کی ہیں[۶۱] اور بدھ دھرم کے اس اصول کو کہ ذات پات کا نظام درست نہیں ہے، اسے راشٹر گھاتک اور بھارت دروہی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

بے شمار بدھ بھکشوؤں نے بھارت کے بدھ عوام کے درمیان یہ ملک دشمن (राष्ट्रद्रोही) ہند دشمنی (भारतद्रोही) اور غیر معقول (बुद्धिहीन) پیغام دینا شروع کیا کہ بدھ دھرم ذات پات یا ملک نسل کو نہیں مانتا۔[۶۲]

اس کے اور بھی مظاہر معاصر تاریخ میں دیکھنے کو ملتے ہیں مثلاً ۱۹۳۲ میں جب برٹش حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ اچھوتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق ہے تو اس کے خلاف برہمنوں نے زبردست احتجاج کیا، بھوک ہڑتالیں کیں۔ مثلاً برودا گوئل (Yeravda Gaol) نے بھوک ہڑتال کی۔ یہ ہنگامہ آرائی کئی ماہ تک چلتی رہی۔[۶۳]

ہندتو کی تحریک اس نظام کو دوبارہ رائج کرنا چاہتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ موجودہ جمہوری عہد میں ایسا ہونا آسان نہیں ہے اور ان نظریات کو لے کر کسی گروہ کا اقتدار میں آنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے وہ زبانی طور پر کہتے ہیں کہ آج کے دور میں یہ نظام نقصان دہ ہو چکا ہے۔[۶۴] اپنی رائے کے عملی اظہار کے لیے انہوں نے ہندو مہا سبھا کے زیر نگرانی ''سد بھاؤ ابھیان'' شروع کیا ہے تا کہ چھوت چھات کے تصور کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکیں اور اس مقصد کے لیے بڑی تعداد میں سنت سرگرم عمل ہیں[۶۵] لیکن یہ سب محض حیلہ جوئی ہے، ورنہ ورن آشرم کے بغیر ہندو دھرم کا تصور ہی نہیں اور ویدک دھرم بغیر ورن آشرم کے بھی ممکن ہے۔ کسی حد تک رو بعمل ہو لیکن آج کا سیاسی ہندو مذہب، جس کی علم بردار فاشسٹ جماعتیں ہیں، وہ تو صرف ورن آشرم پر ہی یقین رکھتا۔ ہے۔ ہندو سماج یا ہندو مذہب کا کوئی الوہی تصور ان کے یہاں رائج نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جس لٹریچر نے یہ تفریق و تقسیم کی تھی یہ لوگ اس لٹریچر کی تقدیس بیان کرتے ہیں، ان کتابوں خاص طور منوسمرتی اور پرانوں نیز عظیم رزمیہ رامائن اور مہابھارت میں

برہمن کی عظمت اور شودر کی ذلت کے مضامین بھرے پڑے ہیں، ان کو اپنا مقدس سرمایہ ماننے کا لازمی نتیجہ ہے کہ ان میں بیان کردہ تعلیمات بھی واجب العمل ہیں جن میں ایک تعلیم ورن آشرم کی بھی ہے۔

ا۔ زبان:

زبان کا مسئلہ تہذیب وثقافت اور تعلیم وتعلم دونوں کے لیے بہت اہم ہے بلکہ یہ بھی کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زبان ہی قومی تہذیب کا تعین کرتی ہے۔ ہندتو کے علمبرداروں نے بھی اس کو سرفہرست رکھا۔ زبان کے سلسلے میں یہ گروہ بہت حساس ہے، زبان کے مسئلے کو یہ لوگ آزادی اور غلامی کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک غیروں کی زبان کو اختیار کرنا غیروں کی غلامی کے مترادف ہے۔

ہندستان کثیر لسانی ملک ہے، مختلف صوبوں اور خطوں میں مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں، ان زبانوں کے اپنے اپنے امتیازات ہیں اور اپنی تہذیب وثقافت ہے اور بعض زبانوں کے پاس ترقی یافتہ ادبی سرمایہ بھی ہے۔ اس لیے ہندستان کے تناظر میں زبان کے حوالے سے درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

ا۔ ملک میں کوئی ایک رابطے کی زبان ہونی چاہیے، جس کے ذریعے سارے ملک کو مخاطب کیا جاسکے۔ لیکن زبان کون سی ہو، کیا اس ملک کے کسی صوبے میں بولی جانے والی زبان کو رابطے کی زبان بنایا جاسکتا ہے؟ اور اگر ایسی زبان کو رابطے کی زبان بنایا جائے تو دوسرے صوبوں یا علاقوں کے لوگ اس کو کس طرح تسلیم کریں گے۔

۲۔ ذریعہ تعلیم کس زبان کو بنایا جائے، علاقے کی زبان کو یا رابطے کی زبان کو یا پھر کوئی اور زبان جو نہ علاقے کی ہو اور نہ رابطے کی بلکہ محض علمی زبان ہو جیسے انگریزی۔

۳۔ سرکاری زبان کیا ہو؟

۴۔ کیا سرکاری یا رابطے کی زبان ایک ہوسکتی ہے اور کیا اس کی جبری تعلیم دی جاسکتی ہے؟ وغیرہ۔

اسی طرح کے سوالات سے مفکرین اور قائدین نے بحث کی ہے۔ چونکہ وہ بحث موضوع سے غیر متعلق ہے اس لیے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سلسلے میں ہندتو کے علم

برداروں بالخصوص آر۔ایس۔ایس کے خیالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

گرو گولوالکر نے زبان سے متعلق متعدد مقامات پر کئی طرح کی باتیں کہی ہیں۔کبھی سنسکرت کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کی بات کہی ہے اور کبھی ہندی کو، لیکن ہندی کو اختیار کرنے کی وجہ صرف اس کا چلن لکھا ہے جبکہ سنسکرت کے ساتھ جذباتی وابستگی کا بھی شاخسانہ جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سنسکرت کے بارے میں گرو گولوالکر نے لکھا ہے ''سنسکرت انتہائی ترقی یافتہ زبان ہے۔اس کے پاس الفاظ کا معیاری ذخیرہ (شبد بھنڈار) ہے، جو آج کے دور کی علمی ضرورت کو پورا کرسکتا ہے اور سنسکرت سے ہمارا جذباتی لگاؤ بھی ہے، اس لیے سنسکرت کو ہماری قومی زبان ہونا چاہیے۔ [۶۷]

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ہندستان میں مختلف زبانیں رائج ہیں اور کوئی رابطے کی زبان نہیں ہے، اس مقصد کے لیے بھی سنسکرت کو اختیار کرنا مفید ہوگا۔ چونکہ کام چلاؤ سنسکرت سیکھنا بہت آسان ہے۔اس لیے اگر سنسکرت رابطے کی زبان ہو تو اس سے مختلف ریاستوں میں ذہنی ہم آہنگی بھی پیدا ہوگی۔ [۶۸]

ایک دوسرے مقام پر یہ عندیہ دینے کی کوشش کی ہے کہ تمام وہ زبانیں جو ہندستان کے طول وعرض میں بولی جاتی ہیں وہ سب قومی زبانیں ہیں (غالباً لفظ قومی راشٹریہ یا سرکاری کے معنی میں نہیں بلکہ ہندو قوم کے مفہوم میں ہے) لیکن رابطے کی زبان ہندی کو بنانا چاہیے، چونکہ ہندی سہل بھی ہے اور اس کو ہر آدمی بخوبی سمجھتا ہے بلکہ سنسکرت سے عوامی رشتہ ٹوٹنے کے بعد ایک ہزار سال کے وقفے میں جو زبانیں ترقی پذیر ہوئیں، ان میں سب سے آسان ہندی ہے۔ [۶۹] یہاں گولوالکر نے سنسکرت کی جگہ ہندی کو اختیار کرنے کی بات کہی ہے۔ تاہم ہندی کا چلن عام ہو گیا ہے۔اس لیے اس کو بدرجہ مجبوری قبول کیا گیا ہے ورنہ جہاں تک ادب کا معاملہ ہے، تو ہندستان کی دوسری زبانیں ہندی سے زیادہ ترقی یافتہ اور قدیم ہیں۔ مثلاً تمل ڈھائی ہزار سال پرانی زبان ہے لیکن ہندی کے عام ہونے کی وجہ سے راج بھاشا اسی کو ہونا چاہیے۔ [۷۰] آر۔ ایس۔ ایس کی سفارشوں میں بھی ہندی کی ہی مانگ کی گئی ہے۔ [۷۱] بعض نمایاں ہندو رہنماؤں مثلاً پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ نے بھی ہندی کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ پرشوتم داس ٹنڈن نے کہا تھا کہ میرے لیے ہندی کا مسئلہ سوراج کا مسئلہ ہے۔ مشہور شاعر بھارتیندو ہرشچندر نے قومی زبان کو ترقی کی جڑ قرار دیا ان کا مشہور دوہا ہے۔

निज भाषा उन्नत ऐहे सबउन्नति को मूल!

निज भाषा उन्नत विना मिटे न हिए को सूल !!

اور ہندی کو نافذ کرنے کی یہ ساری جدوجہد ایسے وقت میں ہوئی جب ہندستان میں عوامی سطح پر اردو کا چلن عام تھا اور ہندی کے جاننے والے خال خال ہی نظر آتے تھے۔

ہندی کو سرکاری یا قومی زبان بنانے اور سنسکرت کے سرکاری زبان بن جانے کی تمنا کرنے کے عقب میں کیا مقصد کارفرما ہے اس کی وضاحت کہیں نہیں ملتی۔ ایک جگہ صرف اتنا لکھا ہے کہ اس سے ملک کے طول و عرض میں ہم آہنگی پیدا ہوگی لیکن یہ عمومی بات ہے اگر ایک ملک کے باشندے کسی بھی زبان کو من حیث المجموع قبول کرلیں تو وہ ان کی رابطے کی زبان ہو جاتی ہے اس میں ہندی کی خصوصیت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندستان جیسے ملک میں جہاں متعدد زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہوں کسی ایک زبان کو جبراً دوسروں پر لادنا (جیسا کہ ہندی کے معاملے میں کیا گیا ہے) ملک کی سالمیت کے خلاف ہے۔

اردو ایک طویل عرصے تک ہندستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ اس کو جس طرح منصوبہ بند طریقے پر ختم کیا گیا اور اس کی جگہ زبردستی ہندی زبان رائج کی گئی یہ کسی حد تک ان کے عزائم کی پردہ دری کرتی ہے، ان کی نظر میں اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، ان کے خیال میں آج بھی مسلمان اردو کا مطالبہ اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں ایک سیاسی وحدت حاصل رہے۔[۲] لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اردو شمالی ہند کی زبان ہے اور بلا لحاظ مذہب و ملت سب نے اردو کو اختیار کیا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو بنگال کے مسلمان بنگالی کا اور تمل ناڈو کے تمل زبان کا مطالبہ نہ کرتے۔ علاقائی زبانوں کے ادب میں مسلمانوں کی خدمات گراں بہا ہیں۔ بنگالی کے عظیم شاعر قاضی نذرالاسلام ہیں، تمل میں مسلمانوں کا اہم حصہ ہے۔ سال رواں کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ تمل کے ایک مسلمان ادیب کو ہی ملا ہے۔ ملیالم میں مسلمانوں نے بہت کام کیا ہے۔ پنجابی کے بڑے شعراء مسلمان ہوئے ہیں اور دیگر علاقائی زبانوں میں بھی ان کا کردار کم نہیں ہے۔

نظام تعلیم

نظام تعلیم کے سلسلے میں ہندتو کی فکر یہ ہے کہ مغربی نظام تعلیم جو ہندستان میں رائج ہے، قومی روایات سے انحراف ہے، اس کو تبدیل کرکے وہ نظام تعلیم رائج کرنا چاہیے جو ویدک عہد

میں تھا۔ تمام علوم اسی انداز میں پڑھائے جانے چاہییں۔ بلکہ موجودہ علوم کو ترک کر کے انہیں علوم کو پڑھانا چاہیے اس لیے کہ وہ علوم پورے طور پر ترقی یافتہ اور زمانے کی ضروریات کے عین مطابق ہیں۔

زبان کے سلسلے میں یہ کہتے ہیں کہ سنسکرت پڑھائی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ دیوتاؤں کی زبان ہے اور مختلف لسانی اختلافات اس زبان سے دوری کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔[۳] اس لیے بھی سنسکرت کو عام کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کو سرکاری زبان بنانا چاہیے[۴] غالباً اس طرح وہ لسانی اختلافات کی خلیج کو پاٹنا چاہتے ہیں اور ملک کی دیگر علاقائی زبانوں کی جگہ پر سنسکرت کو رائج کرنا چاہتے ہیں

زبان کے علاوہ انہوں نے تاریخ، جغرافیہ اور مذہب سبھی موضوعات کے پڑھانے کی سفارش کی ہے۔[۵] لیکن اپنے مخصوص نظریے کے مطابق مثلاً تاریخ میں یہ پڑھایا جائے کہ ہندستان کی سرزمین ابدالآباد سے انتہائی متمدن اور ترقی یافتہ ہندوؤں کا مسکن رہی ہے اور یہاں ہمیشہ سے ہندو طرز زندگی ہی رائج رہا ہے۔ ہندستان کی تاریخ میں مختلف ادوار نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی دور ہے یعنی ہندو دور، اس ہندو دور پر گزشتہ ہزار سال سے زوال آیا ہوا تھا، اس دوران ہندوؤں نے اپنی قومی زندگی کی بازیافت کے لیے جدوجہد کی۔ اس ہزار سالہ دور کو سنگھرش کا دور کہا جاتا ہے۔

طلبہ کو بنیادی تعلیم یہ دینے کی سفارش کرتے ہیں کہ ان میں اپنی معرفت پیدا ہو، وہ ہندستان کی عظمت سے آگاہ ہو سکیں اور دنیا کی تاریخ میں ہندستان کا جو مقام ہے اس کو جان سکیں۔ ان کے دلوں میں قومیت کا بھی مضبوط تصور جاگزیں کرنا چاہیے اور انہیں بتانا چاہیے کہ ساری انسانیت کی فلاح و بہبود ہندستان کی ترقی میں ہے اور ساری انسانیت کی تعلیمات کا خلاصہ ہندستان کی تعلیمات میں ہے۔[۶]

نظام تعلیم کے اس تصور کی بنیاد بھی عظمت ہند کے خیالی تصور پر ہے۔

باب سوم

ہندتو اور مسلمان

ہندو مسلم آویزش: تاریخی پس منظر

ہندستان میں پندرہ کروڑ سے زائد مسلمان آباد ہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد ان ہندی الاصل مسلمانوں کی ہے، جن کے آباؤ اجداد نے اسلام کی سیدھی سچی باتوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا اور کچھ تعداد ان عرب، افغان، ترک اور ایرانی نژاد مسلمانوں کی ہے، جو عہد وسطیٰ میں یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے اور پھر اسی خاک کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ اس طرح آج جو مسلمان یہاں آباد ہیں، ان کا رشتہ اس سرزمین سے صدیوں پرانا ہے۔ ان مسلمانوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں اس ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف کیں۔ یہاں ایک بہترین مواصلات کا نظام اور کشادہ و سیع سڑکیں بنائیں، خوبصورت عمارتوں سے اسے مزین کیا، تعمیرات کا بہترین فن دیا، پرامن نظام حکومت عطا کیا، تاریخ میں پہلی بار ہندستان کی وحدت کا تصور دیا، یہاں ان علوم و فنون کی داغ بیل ڈالی جو وسط ایشیا میں رائج تھے، یہاں کے علوم و فنون کو ترقی دی، یہاں کی زبانوں خاص طور پر سندھی، بنگلہ، پنجابی، تمل اور ہندی کو ایک معیاری ادب بخشا، بلکہ ہندی کے بانی کی حیثیت سے مسلمہ طور پر امیر خسرو کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کبیر، ملک محمد جائسی، رحیم، آس خان اور ملا داؤد وغیرہ ہندی کی صف اول کے شاعر مانے جاتے ہیں۔

مسلمانوں نے ہندستان میں تقریباً سات سو سال تک حکومت کی۔ ان کی حکومت مذہبی تعصب اور مذہبی جنون جیسے تصورات سے نا آشنا تھی۔ پورے مسلم عہد حکومت میں فرقہ واریت کی بنیاد پر شاذ و نادر ہی کوئی واقعہ رونما ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس عہد میں بعض ایسی معرکہ آرائیاں

ہوئیں، جن میں ایک طرف ہندو حکمراں تھے تو دوسری طرف مسلمان۔ لیکن ان کا تعلق مذہب سے بالکل نہیں تھا بلکہ یہ خالص سیاسی اقتدار کی جنگیں تھیں۔ وہ ویسی ہی تھیں جیسی کہ دکن اور دہلی کے مسلم حکمرانوں کے درمیان لڑی گئیں۔ رانا پرتاپ اور رانا سانگا کی فوجوں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ خانوہ کے میدان میں بابر کا مقابلہ رانا سانگا نے ابوبکر لودھی کی زیر قیادت کیا۔ ان کی دولاکھ کی فوج میں تقریباً نصف مسلمان تھے۔ راجہ حسن خاں کی میواتی فوج میں تیس ہزار مسلمان تھے۔ اس لیے ان جنگوں کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش تاریخ سے اپنی بولی بلوانے کے مترادف ہے۔ حقیقتاً پورے مسلم عہد میں نہایت مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کا مظاہرہ رہا ہے۔ مسلم سلاطین کا یہ عالم تھا کہ بالکل ابتدائی عہد کے بادشاہوں نے یہاں کی زبان اور انداز بودو باش کو اختیار کرلیا تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے دہلی میں ایک بستی بسائی اور اس کا نام غیاث پور رکھا۔ یہ خالص مقامی رنگ تھا۔ سلطان محمد تغلق نے اودھ کے علاقہ میں سورگ دوار کے نام سے ایک بستی بسائی اور وہ گنگا جل استعمال کیا کرتا تھا بلکہ ہولی بھی کھیلتا تھا اس کے بارے میں عصامی کا مشہور شعر ہے

جماعت بجمعہ برانداختہ
وباہندواں ہولئی باختہ

مسلمان بادشاہوں نے سینکڑوں مندروں کو اراضی وقف کی اور بہت سے مٹھوں کے مہنتوں کو وقف نامے دیئے، ان کے حقوق کی حفاظت کی اور انہیں سہولتیں بہم پہنچائیں۔ بعض مٹھوں میں خود بھی گئے۔ ہندی شاعری کو رواج بخشا۔ ہندی میں کتابیں لکھوائیں۔ سنسکرت کتابوں کے ہندی تراجم کرائے۔ دربار میں ہندی شاعروں کے لیے کوی رائے کا خطاب ہر سال دیا جاتا تھا۔

یہ سب حقائق ثابت شدہ اور محقق ہیں۔ متعدد ہندو مصنفین نے ان کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ان کی عظمتوں کے گیت گائے ہیں اور ایسا تو شاید ہی کوئی مؤرخ ہو، جو ان کی واقعیت سے انکار کرے۔ متعصب ہندو مصنفین بھی ان کا انکار نہیں کرپاتے، سرجادوناتھ سرکار نے جہاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اورنگ زیب کو مطعون کرنے کی کوشش کی ہے، وہیں وہ اس کا بھی برملا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا ہے کہ اس نے مندروں اور مٹھوں کو عطیات دیے اور مذہبی رواداری کو

اپنی پالیسی کا جزو بنایا۔ دوسرے انصاف پسند مؤرخین میں کالکا رنجن قانون گو، رومیلا تھاپر، بپن چندر، آرسی مجمدار اور بشمبر ناتھ پانڈے جیسے متعدد مؤرخین نے اس مذہبی رواداری اور عدل پروری کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور دلائل سے واضح کیا ہے کہ مسلم عہد حکومت کی اصل تاریخ مذہبی جنون یا فرقہ واریت پر مبنی نہیں بلکہ انسانیت، ہمدردی، عدل وانصاف اور ملک کی تعمیر و ترقی پر مبنی ہے۔

کچھ انتہا پسند رہنماؤں جیسے ویر ساورکر یا گولوالکر نے مسلمانوں کی اس تصویر کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اور محض لفظی بازیگری اور غلط تاویلات کا سہارا لے کر بلا حوالہ مسلم مظالم کی داستانیں گھڑی ہیں اور سادہ لوح ذہنوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان مظالم کا بدلہ لیں۔

شمالی ہند میں اورنگ زیب کے بعد کوئی قابل بادشاہ نہ ہوا۔ مغلیہ سلطنت روبہ زوال ہوگئی۔ اس زوال اور کمزوری کا فائدہ اٹھا کر مغربی اقوام نے یہاں اپنے قدم جمانے شروع کیے اور انگریزوں نے تقریباً پورے ہندستان پر اقتدار حاصل کر لیا۔ مسلمانوں کے برخلاف انگریزوں نے ہندستان کو اپنا وطن نہیں بنایا بلکہ اس پر استعماری انداز کی حکومت کی۔ ان کا صدر مقام برطانیہ تھا اور برطانیہ کے بادشاہ کا نائب یہاں حکومت کرتا تھا۔ اس طرح یہ اصلاً غلامی تھی جبکہ مسلمانوں کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے ہندستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن ترک کر دیے اور اس سرزمین کو اپنا وطن بنالیا۔

ہندستانی عوام کو بہت جلد اس غلامی کا احساس ہوگیا تھا، اس لیے انہوں نے برطانوی سامراج کے تسلط کے ساتھ ہی آزادی کی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ ۱۷۵۷ میں پلاسی کی شکست کے بعد سب سے پہلے مداری صوفیہ نے جدوجہد آزادی کی تحریک شروع کی اور مجنوں شاہ مستانہ کی سربراہی میں دو دہائیوں تک جدوجہد جاری رکھی۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان، سید احمد شہید، بہادر شاہ ظفر، تانتیا ٹوپے، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، احمد اللہ شاہ مدراسی، جنرل عظیم اللہ، علماء دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد، علی برادران، مولانا آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مختار احمد انصاری، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، حسرت موہانی، سردار پٹیل، سبھاش چندر بوس، رام پرشاد بسمل، برکت اللہ خاں بھوپالی، اشفاق اللہ خاں اور دیگر مسلم رہنماؤں کی مشترکہ جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد ملک کو استعماری قوتوں سے آزادی ملی۔

ہندستان میں جس وقت تحریک آزادی اپنے نقطہ عروج پر تھی عین اس وقت کچھ انتہا پسند ہندو ذہنیتیں ملک کے اس سماجی ڈھانچے کو بدل کر اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے سرگرم تھیں۔ اگر چہ ان کے پاس ابتداءً کوئی لائحہ عمل نہیں تھا لیکن مسلم دشمنی کی ایک مشترکہ قدر ان کے درمیان موجود تھی، ابتداءً انہوں نے مسلم دشمنی کا بیج بویا اور پھر اس کی بنیاد پر انہوں نے اپنے گرد اس مخصوص ذہنیت کے حامل افراد کو جمع کرنا شروع کیا۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس ہندو مسلم منافرت کے پیدا کرنے میں انگریزوں کا بھی اہم کردار ہے۔ لیکن ان کو زمین یہیں فراہم ہوئی۔ بنکم چندر چٹر جی ان مصنفین میں سے ہیں جنہوں نے اس منافرت کو پیدا کرنے میں خاص کردار ادا کیا۔ ان کی تحریر کردہ ناول آنند مٹھ مسلم دشمنی کا شاخسانہ ہے۔ [ے ے]

۱۹۰۹ میں ہندو مہا سبھا نے ہندی الاصل مسلمانوں کو شدھی کر کے ازسر نو ہندو بنانے کے لیے شدھی سبھا قائم کی۔ رفتہ رفتہ اس کا دائرۂ اثر خاصا بڑھ گیا۔ حتی کہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور سوامی شردھانند[۸] جو ایک وقت میں تحریک خلافت کے سرگرم رکن اور سیکولر روایات کے علمبردار تھے وہ بھی اس میں بہہ گئے۔ بعد میں شدھی تحریک کے روح رواں یہی سوامی شردھانند بنے اور پنڈت مدن موہن مالویہ ہندو احیا پرستی کے علم بردار ہوئے۔

آنند مٹھ اور اس جیسی دوسری کتابوں جیسے ساورکر کی کتاب ہندتو (Hindutua) اور گولوالکر کی کتاب Bunch of thought وغیرہ نے ایک طرف تو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو وسیع کیا۔ دوسری طرف ان کتابوں اور اس فکر کے حامل افراد نے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کی شکل برادران وطن کی نظروں میں بگاڑ دیں اور مسلم عہد اقتدار کی ایسی تشریح کریں کہ وہ مسلمانوں کے مظالم او ہندوؤں کی مدافعت کی داستان ہو کر رہ جائے۔ اسی طرح انہیں ایک طرف یہ موقع ملے گا کہ ہندو عنوان کے تحت ایک بڑے طبقے کو متحد کرسکیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو ملک بدر یا زیر دست کرنے کی ان کی کاوشوں کو بھی ان کے خیال کے مطابق قبولیت ملے گی۔ ساورکر نے اس تصور کو فکری بنیادیں فراہم کیں۔ دنتے دامودر ساورکر جو تعلیم اور پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر تھے ایک طرح کی جارحانہ قوم پرستی میں یقین رکھتے تھے۔ ہندتو کا موجودہ نظریہ انہی کی تخیلاتی زقند کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب Hindutua میں جو ۱۹۱۷ میں شائع ہوئی یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر قوم کے پاس ایک ہوم لینڈ ہوتی ہے، ہندوؤں کا ہوم لینڈ

ہندستان ہے۔ اس ملک میں صرف ہندوؤں کو ہی رہنے کا حق ہے، وہی یہاں کے شہری ہو سکتے ہیں باقی اقوام کا کوئی فرد اگر یہاں رہنا چاہے تو سرکاری اجازت سے اسی طرح رہ سکتا ہے، جس طرح کوئی غیر ملکی رہتا ہے۔ اس کو شہریت کے حقوق حاصل نہیں ہو سکتے۔ البتہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو یہاں اس حیثیت سے بھی رہنے کی اجازت نہیں۔ پارسی اور یہودی رہ سکتے ہیں کیوں کہ وہ قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔

ساورکر نے ایک دوسری کتاب भारतीय इतिहास के छः स्वर्णिमप्रष्ट میں ہندو انتہا پسندانہ نقطہ نظر سے تاریخ ہند کا جائزہ لیا ہے اور مسلمانوں کے خلاف انتہائی سخت زبان اور غیر مناسب رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کتاب میں واضح طور پر صرف مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز رویہ اختیار کیا ہے۔ یونانی حملہ آوروں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مہذب اور تعلیم یافتہ تھے، اس لیے احترام کے مستحق تھے جبکہ مسلمان غیر مہذب، وحشی، راکھشس اور لامذہب تھے اس لیے وہ کسی احترام کے مستحق نہیں ہیں۔ ان کو ملیچھ کہنا زیادہ مناسب ہے۔[۷۹]

اس کتاب میں پرتھوی راج چوہان، رانا پرتاپ، شیواجی اور سلطان ناصرالدین خسرو خاں کو ہندو مذہب کا علمبردار اور ہندو روایات کو از سر نو نافذ کرنے والا بتایا ہے اور ان کے ذریعے لڑی گئی جنگوں کو خالص مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، جبکہ تمام انصاف پسند مؤرخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی جنگیں خالص سیاسی مقاصد کے لیے تھیں۔ وہ دراصل اقتدار کی جنگیں تھیں ان میں ہندو مسلم مسئلہ درپیش ہی نہیں تھا۔ رانا پرتاپ کا سالار اعظم مسلمان تھا جبکہ اکبر کا سپہ سالار راجہ مان سنگھ خود رانا پرتاپ کا بھائی تھا۔ شیواجی کی فوج میں متعدد مسلمان امیر تھے جبکہ اس کے مقابلے میں اورنگ زیب کی فوج کا سپہ سالار راجہ جے سنگھ تھا اور شیواجی نے جے سنگھ کے نام خطوط میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ میری مخاصمت مغل خانوادے سے نہیں ہے بلکہ اورنگ زیب سے ہے۔ اگر تخت دہلی پر اورنگ زیب کے علاوہ کوئی اور بادشاہ متمکن ہوگا تو میں حسب سابق اس کا وفادار رہوں گا۔

سلطان ناصرالدین خسرو خاں ایک نومسلم غلام تھا۔ اپنے آقا کو قتل کر کے حکومت پر قابض ہوگیا اور اس نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کیا لیکن اس کی تمام پالیسیوں کو مؤرخین نے شخصی انتقام پر محمول کیا ہے اس نے کبھی اپنے ہندو ہونے کا اعلان نہیں کیا اور خود اپنا لقب ناصرالدین رکھا جو واضح طور پر اس کے اسلامی کردار کی علامت ہے۔

ساورکر نے اس کتاب میں محض شاعری کی ہے اور اپنے تخیلات کی پرواز کے ذریعے بعض ایسے واقعات بھی فرض کیے ہیں، جن کا تذکرہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ چار حصوں پر مشتمل اس کتاب میں ساورکر نے پوری تاریخ کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔[۸۰]

اس کتاب نے ہندو جارحیت پر مبنی احیاء پرستی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ساورکر نے اس کتاب میں اور اپنی دوسری کتاب ہندتو میں جو نظریات پیش کئے ہیں، ان کو ہندو مہاسبھا نے قبول کرلیا اور وہ تحریک انہی کی علمبردار بن گئی۔ بعد میں ان نظریات کی مزید توسیع اور اشاعت کے لیے ڈاکٹر ہیڈگیوار جن کی تربیت مشہور مہاسبھائی لیڈر بی۔ ایس مونج نے کی تھی ۱۹۲۵ء میں آر۔ ایس۔ ایس کی بنیاد ڈالی اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے پہلے سر سنگھ چالک بھی یہی بنے انہوں نے ایک مختصر سی کتاب स्वयं सेवक संघ : तत्व और व्यवहार کے نام سے لکھی۔ اس میں آر۔ ایس۔ ایس کے بنیادی نظریات اور طریق کار پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب میں لکھا ہے کہ کسی مخصوص خطہ ارضی پر رہنے والے لوگ ایک قوم ہوں یہ ضروری نہیں ہے، بلکہ راشٹر نام ہے۔ ایک قوم، ایک مذہب، ایک تاریخ، ایک نسل، ایک ہی روایات اور ایک ہی ذہن وفکر کے لوگوں کے ایک مخصوص خطے میں رہنے کا، اگر مختلف اقوام وملل اور مختلف تاریخ وروایات کے حامل افراد ایک ساتھ رہتے ہوں تو وہ ایک ملک نہیں کہلائے گا۔ ہندستان ہندوؤں کا ملک ہے اور چونکہ ہندوؤں کی ہی یہ آبائی سرزمین ہے اور ان کی تاریخ، مذہب اور روایات ایک ہیں اس لیے یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے، مسلمانوں، عیسائیوں یا دیگر عناصر خارجی اثرات کا نتیجہ ہیں، ان کی وجہ سے ملک کی یکجہتی متاثر ہوئی ہے۔ ان کو اس ملک میں رہنے کا حق نہیں ہے، اس لیے ہندوؤں کا اولین فریضہ یہ ہے کہ اپنے وطن کو اپنے لیے خالص کریں اور غیر ملکی عناصر کو ملک بدر کردیں، انہوں نے ہندو ذہنیت کو پرتشدد طرز عمل پر ابھارا ہے اور اہنسا وغیرہ پر امن طریقوں کو ناقابل عمل قرار دیا ہے۔ ''اہنسا پرمودھرما'' (अहिंसा प्रमो धर्मा) کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ہمارا اصول ہے، لیکن اس پر عمل جب کیا جائے گا جب ہمارا سماج ساری دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور ہوجائے گا۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر سخت تنقید کی ہے اور اس کی سعی کرنے والوں کو قوم کا غدار قرار دیا ہے۔[۸۱]

آزادی سے قبل ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ بڑے پیمانے پر زیر بحث آگیا تھا۔ تاہم اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں کے سامنے ایک مخصوص مقصد انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا تھا۔

شرکتِ مصائب نے اس مسئلے کو زیادہ سنجیدہ نہیں ہونے دیا۔ لیکن دور بین نگاہیں اس وقت بھی دیکھ رہی تھیں کہ ابھی ایک نقطہ اتحاد ہے، اس لیے اختلافات دبے ہوئے ہیں ۔ لیکن ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد کوئی ایسا نقطہ اتحاد نہیں ہوگا ، جو ہندو اور مسلمانوں کو متحد رکھ سکے ۔ دونوں کے مذاہب الگ ، معتقدات جدا، طرز ہائے بود و باش منفرد، چنانچہ لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۲۴ء میں کانگریس کے صدر آرسی داس کے نام ایک خط میں اس کا اظہار کیا کہ ہندو مسلمان ساتھ نہیں رہ سکتے ۔ اس لیے معقول بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو الگ ملک دے دیا جائے اور ہندوؤں کو الگ۔ ملک کی تقسیم اس طرح ہو کہ بنگال دو حصوں میں تقسیم ہو جائے اور مغرب میں صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان اور آدھا پنجاب مسلمانوں کو دے دیا جائے ۔ باقی ملک ہندوؤں کے پاس رہے ۔[۸۲]

ایک طرف تو بعض رہنما ان خطوط پر سوچ رہے تھے دوسری طرف انگریزوں کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ہندو مسلم اتحاد کا مظاہرہ اسی طرح ہوتا رہا جس طرح اب ہو رہا ہے تو ملک پر اقتدار قائم رکھنا دشوار ہو جائے گا ۔ اس لیے انہوں نے بالا رادہ ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے کی سعی شروع کی ۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ خود وائسرائے ہند نے پنڈت مدن موہن مالویہ کو جو تحریک خلافت کے ایک رکن تھے بلا کر سمجھایا کہ اگر تحریک خلافت کامیاب ہوگئی تو اسلامی حکومت قائم ہوگی، اس سے ہندوؤں کو کچھ حاصل نہیں ہوگا ۔ ساتھ ہی ریشمی رومال تحریک سے متعلق بھی کچھ کاغذات پنڈت جی کو دیے، جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس تحریک کا مقصد بھی ؛ سلامی حکومت قائم کرنا تھا ۔ انگریزوں کی اس کوشش کا خاطر خواہ اثر ہوا ۔ پنڈت مدن موہن مالویہ پورے طور پر اس رنگ میں رنگ گئے اور انہوں نے برملا ہندو مسلم منافرت کا اظہار کرنا شرع کیا ۔ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو متحد کرنے اور مسلمانوں کے خلاف قوت استعمال کرنے تک کے نعرے دیے ۔[۸۳]

لالہ لاجپت رائے بھی اس سے متاثر ہوئے ۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں ممبئی میں ایک ہندو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہندو سیاسی خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو انہیں فرقہ وارانہ طور پر مستعد ہو جانا چاہیے ۔ ورنہ مسلمان ان کو کھا کر ہضم کر جائیں گے[۸۴]

اس پس منظر میں ایسے بے شمار واقعات منظر عام پر آئے کہ بعض مسلم رہنماؤں نے بھی انہی خطوط پر سوچنا شروع کر دیا کہ آزاد ہندستان کا نظام جمہوری ہوگا اور جمہوریت میں حکومت اکثریت کی ہوتی ہے، اس لیے یہاں لازماً حکمرانی ہندوؤں کے حصے میں آئے گی اور مسلمان

اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ان کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ اس لیے اسی میں عافیت ہے کہ لالہ لاجپت رائے کی تجویز کو قابل عمل فرض کرلیا جائے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ جغرافیائی خطے کا مطالبہ شروع کردیا۔ چونکہ دونوں طرف فضا پہلے سے ہموار تھی۔ اس لیے چند مخلصین کا خلوص کہاں تک کام آتا۔ ملک تقسیم ہوگیا اور جیسا کہ پہلے سے معلوم تھا صد فی صد تبادلہ آبادی ممکن نہ تھا۔ دونوں ملکوں میں دونوں مذاہب کے ماننے والے رہ گئے۔ ہندستان میں مسلمان اقلیت میں رہ گئے اور پاکستان میں ہندو اقلیت میں رہ گئے۔ ملک کی تقسیم جو اقلیت میں رہ جانے کے خطرے کو دور کرنے کے لیے ہوئی تھی، اس نے بجائے اس خطرے کو کم کرنے کے دو چند کر دیا۔ پہلے ایک اقلیت کا مسئلہ تھا اب دو اقلیتیں پیدا ہو گئیں۔

آزادی کے موقعے پر ملک میں زبردست گروہی تصادم ہوا، جس میں دس لاکھ سے زیادہ انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ مہاتما گاندھی کے مرن برت کی وجہ سے یہ طوفان وقتی طور پر تھما لیکن اس کے خاکستر میں فساد کی چنگاریاں دبی رہیں اور اسے مختلف اوقات میں مختلف لیڈر کریدتے رہے۔ ملک گروہی فسادات کی آگ میں جلتا رہا۔ اس میں بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ اقتدار اعلی بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔ ۱۹۸۶ء میں ان فسادات کو ایک رخ مل گیا اور بابری مسجد کی علامت پر فسادات ہونے لگے۔ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے انہدام تک بڑے پیمانے پر خون خرابہ ہوا۔ پورا ملک اس آگ میں جلتا رہا۔ بابری مسجد کا انہدام ایک عظیم سانحہ تھا۔ ملک کے تمام باضمیر حلقوں نے اس دن کو بدترین دن سے تعبیر کیا۔ اس مذہبی جنون کی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر شدید مذمت کی گئی۔

بابری مسجد کے انہدام سے ملک کے دانشور اور صائب الفکر افراد کے سامنے یہ سوال آکھڑا ہوا کہ کیا ملک میں قانون وعدلیہ کو برتری حاصل رہے گی یا عوام کا ایک طبقہ جب چاہے ملکی قوانین کو پامال کرتا رہے گا۔

مسلمان ہندتو کی نظر میں

ہندوتو کا لفظ ویر ساورکر نے ۱۹۱۷ء میں استعمال کیا تھا، تاہم ہندو قوم و مذہب کے احیاء کی کوشش اس سے قبل شروع ہو چکی تھیں اور اس کے بعد بھی بعض تحریکیں ابھریں، ان تحریکات میں بیش تر مذہبی نوعیت کی تھیں اور دائرہ کار بھی ہندوؤں کی اصلاح تک محدود تھا۔ ان تحریکات میں

چیتنیہ کی تحریک، رامانند کی ذاتی کاوشیں، بعد کے ادوار میں برہموسماج، آریہ سماج، رام کرشن مشن وغیرہ اہم ہیں۔ ان تحریکات نے مسلمانوں کے بارے میں کوئی مخصوص پالیسی اختیار نہیں کی، بلکہ انہوں نے اسلام کی عظمت کا اعتراف کیا۔ بعض رہنما مثلاً سوامی وویکانند جو جدید ہندو عہد کے معماروں میں سے ہیں انہوں نے اسلام کو ہندستان کی ضرورت قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر ہندستان کے ان دو عظیم مذاہب کا اس طرح اتحاد ہو جائے کہ ویدانت دماغ ہو اور جسم اسلام ہو تو یہ ہندستان کے عظیم مستقبل کا ضامن ہوگا۔

لیکن ہندو احیاء کی وہ کوشش جو ہندتو کے نام سے شروع ہوئی وہ اول دن سے سیاسی نوعیت کی تھی۔ یہ فکر نہ ویدوں یا مذہبی کتابوں سے ماخوذ تھی اور نہ اسے ہندو مذہبی رہنماؤں کی سرپرستی حاصل تھی بلکہ یہ ایک خالص سیاسی نوعیت کی تحریک تھی، جس نے نیم مذہبی لبادہ اوڑھ رکھا تھا، بلکہ مذہب کی ایسی تعبیر کی تھی جو ان کے نظریات کے موافق ہو، قطع نظر اس کے کہ اس سے ہندو مذہب کتنا متاثر یا تبدیل ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل پہلے بھی آچکی ہے۔

ہندتو کی فکر کے مطابق اصولاً یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف ہندوؤں کو ہی رہنے کا حق ہے، یہ سرزمین ہندوؤں کی قومی سرزمین ہے، اس پر غیر ہندو نہیں رہ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس طرح رہ سکتے ہیں جیسے کوئی غیر ملکی رہ رہا ہو، اس کو نہ شہریت کے حقوق حاصل ہوں گے اور نہ اپنے افکار و مذاہب کی تبلیغ کی اجازت ہوگی۔ یہ بات بطور اصول کے ساورکر سے لے کر کے آر ملکانی تک سب تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ تفصیلات میں جزوی اختلاف ہے، تاہم اس فکر میں ایک طرح کا معکوس ارتقاء ہے، جو فکر کی تبدیلی تو کہا جاسکتا ہے البتہ امر واقعہ یا حقائق کا اعتراف اور ان کے مطابق پالیسی وضع کرنا نہیں کہا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر ہیڈ گوار اور اس کے قبل ساورکر کا یہ تصور تھا اور ہندو مہاسبھا بھی اس پر عمل پیرا تھی کہ ہندستان کے مسلمان یا تو ہندو مذہب اختیار کر کے اپنے آپ کو اس طبقاتی نظام کا حصہ بنالیں یا پھر ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ گولوالکر بھی ابتداءً اسی کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب We and our Nationhood Defined میں لکھا ہے:

''ہندستان کے غیر ہندو لوگوں کو ہندو کلچر اور زبان اختیار کرنی چاہیے، ہندو مذہب کا احترام کرنا چاہیے اور اسے مقدس سمجھنا چاہیے۔ اس کے خلاف ان کے دل میں کبھی خیال بھی نہیں آنا چاہیے۔ انہیں اس سرزمین کی قدیم روایات کے لیے ناشکری اور عدم رواداری کا رویہ ترک کر

دینا چاہیے اوراس سے محبت اور قلبی لگاؤ کا اظہار کرنا چاہیے۔اس بات کو ایک لفظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انہیں غیر ملکی نہیں رہنا چاہیے مکمل طور پر ہندو ماتحتی قبول کرنی چاہیے، کسی دعویٰ اور استحقاق کے بغیر یہاں رہنا چاہیے۔ان کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کو شہریت کے حقوق بھی حاصل نہیں ہوں گے۔ [۸۵]

اسی سے ملتی جلتی بات ایک اور موقع پر کہی کہ ''جب غیر ملکی مسلمان ہندستان پر حکومت کرنے کے لیے آئے تو انہوں نے مکمل انتظام کو چلانے کے لیے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر مسلمان بنا لیا۔ چنانچہ آج جو مسلمان ہیں وہ ماضی کے ہندوؤں کی ہی اولاد ہیں۔اس لیے سماج کے اس طبقے کو سوچنا چاہیے اور دوسروں کی تہذیبی غلامی نہیں اختیار کرنی چاہیے۔ [۸۶]

اگرچہ مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے افکار و معتقدات ایسے ہیں، جنہیں ہندتو وادی برداشت کرنا گوارا نہیں کرتے اور وہ ان کو بھی ملک دشمن، غدار وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن مسلم مسئلہ کی اہمیت اس سے زیادہ ہے۔اس لیے کہ وہ تعداد میں بھی سب سے زیادہ ہیں اور ماضی قریب میں ایک طویل عرصے تک انہوں نے ملک پر حکمرانی کی ہے۔اپنی آبادی کے اعتبار سے وہ ملک کے سیاسی نظام پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہیں اور تمام قومی، ملی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں میں ان کا اہم کردار رہا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہندتو وادی اس مسئلے کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔اس موضوع پر انہوں نے بحث و تحقیق بھی کرائی ہے۔ ہندو مہا سبھا کے ایک اہم رہنما B.N. JOG نے ۷۰۰ صفحات پر مشتمل مراٹھی زبان میں ایک ضخیم کتاب اس موضوع پر لکھی۔اس کتاب کا نام हिन्दु मुस्लिम सकता : भम्र और वास्तविक्ता ہے۔اس کا ایک حصہ اسی نام سے ہندی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

گولوالکر نے اپنی کتاب Bunch o thoughts میں متعدد جگہ مسلم مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔اسی کتاب کے ایک باب میں ملک کو درپیش اندرونی خطرات میں تین خطرات شمار کرائے ہیں۔۱۔ مسلمان، ۲۔ کمیونسٹ اور ۳ عیسائی۔ مسلمانوں پر کتاب کے صفحہ ۲۳۳ سے ۲۴۷ تک گفتگو کی ہے۔اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

''مسلمانوں کے بعض لیڈر یہ کہتے ہیں کہ فسادی قسم کے مسلمان، جنہوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، وہ پاکستان چلے گئے، اب ہندستان میں صرف اچھے اور ملک کے وفادار مسلمان باقی رہ گئے ہیں۔لیکن یہ بات درست نہیں ہے بلکہ درست یہ ہے کہ جو مسلمان پاکستان گئے، وہ

ملک کے وفادار تھے جبکہ یہاں باقی رہ جانے والے خاص طور پر یوپی کے مسلمان وہ تھے، جنہوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا چنانچہ پنجاب، بنگال، سندھ اور صوبہ سرحد میں ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو شکست ہوئی تھی اور کانگریس کو کامیابی ملی تھی۔ بعد میں کانگریس کی غلط پالیسیوں اور غلطیوں کی وجہ سے وہاں مسلم لیگ کا نفوذ ہوا۔ اس کے برخلاف یوپی کے مسلمانوں نے پاکستان کی حمایت کی اور وہ آج بھی یہاں موجود ہیں تو کیا ہندوؤں سے ان کی نفرت کا جذبہ راتوں رات ختم ہوگیا ہوگا ایسا سوچنا ہمارے لیے خودکشی کے مترادف ہے۔

پاکستان کی تشکیل ہندستان کے بارے میں مسلمانوں کے اس خواب کی تعبیر ہے، جو وہ بارہ سو سال سے دیکھتے آرہے تھے یعنی ہند پر ان کو بلا شرکت غیرے مکمل اقتدار حاصل ہو جائے، پاکستان اس خواب کا عملی ظہور ہے۔ (مشہور مؤرخ آرنولڈ ٹوائن بی (Arnold Toyn bee) کا اسی قسم کا ایک قول بھی بلا حوالہ نقل کیا گیا ہے۔)

گروجی آگے لکھتے ہیں:

> ہندستان میں ایک بڑا طبقہ پاکستان نواز موجود ہے جو پاکستان کی حمایت کر کے باقی ملک کو بھی پاکستان بنا دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ملک کے حساس علاقوں میں وہ اپنی تعداد مسلسل بڑھا رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں مسلمان صرف ۱۱٪ فیصد تھے اور آج (۱۹۶۰) میں ان کی تعداد دگنی ہوگئی ہے۔ یہ سب اسی سازش کا نتیجہ ہے۔ مسلمان ملک میں مختلف مقامات پر اسلحے بھی جمع کر رہے ہیں۔ چنانچہ صرف کلکتہ کی ناخدا مسجد میں اتنا اسلحہ جمع ہے کہ آدھے کلکتہ کو اس کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے۔

گروجی نے آگے مسلمانوں کی داستان ظلم سنائی ہے۔ ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی نفرت، مسلمانوں کی وحشت و بربریت، ہندستان میں چھوٹے چھوٹے پاکستان اور اسی طرح کے دیگر عنوانات کے تحت زور قلم صرف کیا ہے اور حکومت پر الزام لگایا ہے کہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے اور مسلمانوں کی منہ بھرائی کرتی ہے۔

آگے بعض متعینہ الزامات لگاتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ مسلمان پاکستان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں اور ان کا براہ راست پاکستان سے تعلق ہے۔ ۱۹۶۳ء میں مالیگاؤں میں فساد ہوا۔ یہ فساد ۹ یا ۱۰ بجے شب میں ہوا اور صبح کی خبروں میں پاکستان سے یہ خبر نشر کی گئی کہ فلاں شہر میں مسلمانوں کا زبردست قتل عام ہوا ہے۔ اگر مسلمانوں کا پاکستان سے براہ راست ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ نہیں ہے تو یہ خبر پاکستان اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی۔ وغیرہ۔

قوم پرست مسلمان جیسے مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے سامنے ملکی مفادات کبھی نہیں تھے بلکہ صرف مسلمانوں کا مفاد ان کے پیش نظر تھا۔ یہ مسلمانوں کے رہنما تھے، انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے مسائل کا تو ذکر کیا لیکن ہندوؤں کے مسائل کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کی مظلومیت اور جناح کی بے وقوفی کا تو رونا رویا ہے لیکن مسلمانوں نے کلکتہ اور نواکھلی میں ہندوؤں پر جو مظالم ڈھائے تھے ان کا کہیں تذکرہ نہیں کیا۔ دراصل مولانا آزاد پورے ہندستان کو پاکستان بنانا چاہتے تھے اور وہ اسی لیے ہندستان میں رہ گئے۔

اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھا ہے: مسلمان آج بھی ملک دشمنی کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی وفاداریاں دوسرے ممالک کے ساتھ ہیں۔ ان کے مقامات مقدسہ مکہ اور مدینہ میں ہیں اور آج بھی یہ لوگ لڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک مسلم وزیر نے کہا ہے کہ اگر مسلمانوں کے حقوق کی اچھی طرح حفاظت نہیں کی گئی تو یہاں بھی اسپین کی تاریخ دہرائی جاسکتی ہے۔[۸۷] اس لیے ہمیں اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہیے۔[۸۸]

اس طویل گفتگو میں گرو جی نے مسلمانوں کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے اس کی تلخیص اس طرح کی جاسکتی ہے۔

(۱) مسلمان ظالم و وحشی ہیں، بربریت ان کے مزاج کا عنصر ہے۔

(۲) مسلمان ہندستان میں رہتے ہیں لیکن ان کی وفاداریاں پاکستان اور دیگر ممالک کے ساتھ ہیں۔

(۳) مسلمان ہندستان کو بھی پاکستان بنا دینا چاہتے ہیں۔

(۴) مسلمانوں میں ایک بھی قوم پرست یا ملک دوست آدمی پیدا نہیں ہوا حتی کہ مولانا آزاد جو سب سے بڑے مسلم نیشنلسٹ رہنما فرض کئے جاتے ہیں وہ بھی ملک دوست نہیں تھے بلکہ وہ ہندستان کو پاکستان بنانا چاہتے تھے۔

یہ طرز گفتگو اور انداز فکر جس طرح یک طرفہ سوچ اور منفی رجحان پر مبنی ہے اس میں کسی طرح کی یگانگت یا مفاہمت کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ سراسر زور زبردستی اور فکری ژولیدگی کی علامت ہے اور دوسرے فریق کو بلاوجہ یک طرفہ مطعون کرنا ہے۔ اس سے کسی مثبت نتیجے کی توقع فضول ہے۔ گولوالکر کی یہ تحریر ۱۹۶۵ء سے قبل کی ہے۔

۱۹۶۵ء کے بعد ان کی تحریروں سے کم از کم یہ عندیہ ملتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں ان خطوط پر نہیں سوچ رہے ہیں، جن پر ڈاکٹر ہیڈ گیوار نے سوچا تھا۔ یا ابتداءً گولوالکر نے جو تصور دیا تھا گویا یہ ان کے فکری ارتقاء کا ایک مظہر ہے۔ اس کے بعد کی تحریروں میں ان کا یہ معکوس ارتقاء زیادہ واضح ہو کر سامنے آیا ہے اور غالباً صورت واقعہ کی ناگزیریت کو تسلیم کر کے انہوں نے اپنے رویے پر نظر ثانی کی ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں اخباری نمایندوں سے بات چیت کرتے ہوئے گولوالکر نے اس پر زور دیا کہ مسلمانوں کو اپنے قریب لانے اور ان کے ساتھ مفاہمت کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ہندو فرقے کی ذمے داری ہے۔

جون ۱۹۷۰ء میں ایک صحافی نے گولوالکر سے دریافت کیا کہ آپ کی نظر میں ہندو مسلم مسئلے کا حل کیا ہے؟ گولوالکر نے جواب دیا کہ اگر مسلمان اس ملک کی تہذیب کو اپنا لیں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور انہیں یہ مسئلہ حل کرنا ہی چاہیے۔ چونکہ ہندستان کی تاریخ محمود غزنوی سے تو شروع ہوتی نہیں؟ (یعنی محمود غزنوی کو جس طرح اپنی قوم کا ہیرو مانتے ہیں اسی طرح یہاں کی قدیم شخصیات کو بھی تسلیم کر لیں) صحافی نے دوسرا سوال کیا کہ مسلمانوں کو اس کی تعلیم کون دے گا۔ گولوالکر نے جواب دیا۔ ''ہم اور آپ''[۸۹] گویا ہندو حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس کی تعلیم دیں۔

ایک اور موقعے پر گولوالکر سے پوچھا گیا کہ ملک کی مکھیہ دھارا سے کیا مراد ہے۔ اور کیا مکھیہ دھارا کے علاوہ کچھ اور بھی دھارائیں ہیں؟ گولوالکر نے وضاحت کی کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ سب لوگ اپنے اپنے مخصوص تشخص کو زیادہ بہتر طریقے پر اختیار کریں اور اس ملک کی قومی زندگی کے بنیادی ڈھانچے میں شامل ہو جائیں۔ مثلاً مسلمان زیادہ خدا پرست مسلمان بنیں۔ میں ان کو زیادہ خدا پرست مسلمان بننے میں مدد دوں گا۔ ہندستان ایسا ملک ہے، جہاں دنیا کے مختلف گوشوں سے لوگ آئے اور انہوں نے یہاں کی بود و باش اختیار کی بلکہ یہاں کی قومی زندگی میں اہم کردار ادا کیا اور وہ اس کا حصہ بن گئے۔ مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ اس ملک کے قومی ڈھانچے میں ضم ہو جائیں۔[۹۰]

ایک مرتبہ خشونت سنگھ سے مسلمانوں کے بارے میں پوچھا کہ مسلم مسئلے کا کیا حل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے جذبات کو محبت سے جیتنا ہی واحد حل ہے۔[۹۱]

گولوالکر نے ڈاکٹر سیف الدین جیلانی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''بھارتی کرن'' کا

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کوئی اپنا طریقہ عبادت ترک کردے۔[92] ہمارا مطالبہ عبادت کا طریقہ تبدیل کرنے کا نہیں ہے بلکہ قومی زندگی میں شامل ہونے کا ہے۔

ڈاکٹر سیف الدین جیلانی نے مسلم مسائل پر گولوالکر سے تفصیلی گفتگو کی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندو مسلم منافرت کا اصل سبب گائے کشی ہے۔ اس کی وجہ سے کئی مرتبہ فسادات ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے ترک کردیں اور اپنے لیے مخصوص سہولتوں کا مطالبہ نہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ کی بھی اصلاح کی جائے۔ تاریخ میں یہ پڑھایا جائے کہ عہد وسطیٰ میں غیر ملکی حملہ آوروں نے ہندستان پر حملے کیے، ان کی وراثت ہندستانی مسلمان نہیں ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قومی شخصیات، جیسے رام، کرشن وغیرہ کا احترام کریں، ان کو بھگوان نہ مانیں لیکن ان کو بحیثیت قومی افتخار کے تو قبول کرسکتے ہیں جیسے کہ مسلمان رستم[93] کو قومی افتخار کی علامت سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں سے متعلق آر۔ ایس۔ ایس کی بنیادی فکر یہی ہے۔ یہ فکر جس فکری ژولیدگی اور معلومات کی کمی پر مبنی ہے۔ اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مسلمانوں سے مطالبات

تاہم ان تحریروں میں اور بی این جوگ اور بعض دوسرے ہندتووادی مصنفین نے مسلمانوں کے متعلق جو مثبت رویہ اختیار کیا ہے اور مسلمانوں کو اچھا ہندستانی بننے کے لیے ان کے کیا مطالبات ہیں اگر انہیں مرتب کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ درج ذیل ہوسکتے ہیں:

(۱) عہد وسطیٰ میں جن مسلم حکمرانوں نے یہاں حملے کیے اور یہاں حکومت کی وہ سب غیر ملکی تھے۔ یہاں کے مسلمان اپنے آپ کو ان سے بری الذمہ اور الگ ہونے کا اعلان کریں۔

(۲) مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے دور حکومت کے مظالم کے لیے ہندوؤں سے معافی مانگیں۔

(۳) مسلمان اس ملک میں رہتے ہیں تو یہاں کا کلچر اختیار کریں اور یہاں کی قومی زندگی میں ضم ہوں اور یہاں کی قومی شخصیات کا احترام کریں۔

(۴) یکساں سول کوڈ کو تسلیم کریں۔

(۵) طلاق اور تعدد ازدواج کو ترک کردیں۔

(۶) ذبح گائے سے باز رہیں۔

(۷) ایودھیا، کاشی اور متھرا کے جو مندر مسلمانوں نے مسمار کیے اوران کی جگہ مسجدیں تعمیر کیں، ان کو ہندوؤں کے حوالے کردیں۔

(۸) اپنے لیے وقتاً فوقتاً نت نئی سہولتوں کا مطالبہ بند کردیں۔

یہ مطالبات کسی سنجیدہ فکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ محض صحافیانہ ذہن کی پیداوار ہیں اور اگر معروضی انداز میں ان پر غور کیا جائے تو یہ اس قابل بھی نہیں کہ ان پر گفتگو کی جا سکے۔ لیکن مسلسل ان اعتراضات کو دہرایا جاتا ہے اور انہیں حقیقی مسائل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ان کی حقیقت واضح کی جائے۔

مطالبات کا جائزہ

جہاں تک پہلے مطالبے کا تعلق ہے تو یہ واضح ہے کہ مسلمانوں نے عہد وسطیٰ کے سلاطین اور حکمرانوں کو نہ کبھی مذہبی تقدس کا مقام دیا اور نہ ان کو اپنا ہیرو فرض کیا۔ ان کی حیثیت عام مسلمانوں کی نظر میں محض بادشاہوں کی ہے۔ ان کا اوّلین مقصد اپنے اقتدار کو مضبوط و مستحکم رکھنا تھا۔ انہوں نے خود بھی کبھی اپنے اسلامی رہنما ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ اپنی یہ حیثیت محسوس کی کہ وہ غلبہ اسلام یا اشاعت اسلام کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ شخصی طور پر ان کا مذہب اسلام تھا لیکن انہوں نے اپنے مذہب کو کبھی رعایا پر زبردستی نہیں تھوپا۔ اس بات کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ شمالی ہند میں تقریباً آٹھ سو سال تک مسلم عہد حکومت رہا، اس کے باوجود یہاں کا غالب مذہب اسلام نہیں ہے بلکہ ہندو دھرم ہی ہے۔

عہد وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کی حکومت مذہبی تعصب پر مبنی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے معاصر ہندو راجاؤں سے قریبی روابط استوار کیے، ان کو اپنے برابر کا درجہ دیا، ملک جو تتر بتر ہو رہا تھا، جہاں امن و عافیت کا نام نہیں تھا، ڈاکوؤں اور لٹیروں کا راج تھا۔[۹۴] اس انارکی کو ختم کر کے عدل و انصاف پر مبنی نظام حکومت عطا کیا، یہاں کی اچھی باتیں اختیار کیں اور خود بھی یہاں کی تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہوئے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ آج جو قومی تہذیب یا تمدنی و ثقافتی اثاثہ ہے، وہ انہی مسلم حکمرانوں کا عطا کردہ ہے اور اسی عہد سلاطین اور مغل حکمرانوں کی دین ہے۔

تاریخی طور پر یہ بات بھی درست ہے کہ مسلم عہد میں ہندو رعایا کو پورے حقوق حاصل تھے۔ ان کے مذہب میں کسی بھی قسم کی مداخلت مسلمانوں نے نہیں کی، ان کا مذہبی انتظام مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں رہا، پنڈتوں اور مذہبی رہنماؤں کو ٹیکس وغیرہ سے مستثنیٰ قرار دیا۔ سینکڑوں مندروں اور مٹھوں کو ہزاروں بیگھہ اراضی بطور عطیہ دی۔ متعدد پروہتوں اور ہندو مذہبی رہنماؤں کو عزت واحترام کا مقام بخشا۔

مسلم حکمرانوں کے مجموعی اصول حکمرانی کے طور پر بابر کی اس وصیت کو پیش کیا جاسکتا ہے، جو اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کے لیے لکھ کر دی تھی۔ اس وصیت کے بنیادی نکات یہ ہیں:

میرے بیٹے! ہندستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ یہ اللہ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنا دیا ہے۔ اپنی بادشاہی میں تمہیں درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

- تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دینا اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رورعایت کے بغیر سب کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔
- گائے کشی سے بالخصوص پرہیز کرنا تاکہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان وشکر کی ڈوری میں بندھ کر تمہارے مطیع ہوجائیں۔
- تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہیے تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن وامان رہے۔
- اسلام کی اشاعت ظلم وستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف واحسان کی تلوار سے بہتر ہوسکے گی۔
- شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہنا کیوں کہ اس سے اسلام کمزور ہوجائے گا۔[۹۵]

اس وصیت میں واضح طور پر مذہبی تعصب، ہندوؤں کے مذہبی مقامات بلکہ گائے کشی تک سے پرہیز کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ مغل حکمرانوں نے بابر کی اس وصیت پر پورے طور پر عمل کیا۔ انہوں نے کبھی مذہبی تعصب کو راہ نہیں دی۔ ہندوؤں کے مذہبی تشخص کو برقرار رکھا اور ان کے مذہبی اداروں کی سرپرستی کی۔ اورنگ زیب کو تمام مغل حکمرانوں میں سب سے زیادہ متعصب کہا جاتا ہے جب کہ اس کی مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ اس نے متعدد مندروں اور مٹھوں کو ہزاروں بیگھہ اراضی بطور عطیہ دیں۔ اس قسم کے متعدد فرامین ہنوز موجود ہیں۔

ہندو ثقافت سے اورنگ زیب کی دلچسپی کے ثبوت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ خود ہندی کا اچھا شاعر تھا۔ اس نے فارسی شاعروں کو دیے جانے والے خطابات موقوف کرا دیے تھے لیکن ہندی شاعروں کو دیا جانے والا خطاب ''کوی رائے'' برابر جاری رکھا۔

اورنگ زیب کی مثال یہاں محض اس لیے دی گئی ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ تعصب و نفرت کے ذیل میں اس کا نام لیا جاتا ہے اور بڑی شدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ورنہ دیگر مسلم باشاہوں کا رویہ بھی رواداری میں ایسا ہی تھا۔ اکبر نے ایک دارالترجمہ قائم کر کے سنسکرت کی کتابوں کے فارسی تراجم کرائے، فیروز شاہ تغلق کو ہندی ادبیات سے لگاؤ تھا، ٹیپو سلطان سنسکرت جانتے تھے اور ان کے تعلقات ہندو مہنتوں سے نیازمندانہ تھے۔ متعدد علماء اسلام نے ہندی ادبیات میں درک حاصل کیا۔ ہندی زبان و ادب کی بنیاد بھی مسلمانوں نے رکھی اور صوفیہ نے اس ادب کو پروان چڑھایا۔ گیتا، رامائن اور مہابھارت جیسی خالص مذہبی کتابوں کے ایک دو نہیں بیسیوں تراجم فارسی اور اردو میں ہوئے۔[96] دورِ آخر کے مسلم حکمرانوں نے ہندو مسلم اتحاد کی علامت کے طور پر پھول والوں کی سیر کا میلہ[97] شروع کیا، جسے انگریزوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں موقوف کرادیا تھا۔ ہندستانی موسیقی میں امیر خسرو اور تان سین نے غیر معمولی اضافے کیے۔ مغل سلاطین کے عہد میں ہندوؤں کو تقریباً وہی تمام مواقع حاصل تھے، جو مسلمانوں کو۔ متعدد ہندو اس وقت ملک کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے، اکبر جہانگیر اور اورنگ زیب کے زمانے میں راجہ مان سنگھ، مرزا راجہ جے سنگھ اور راجہ جے سنگھ سوائی فوج کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز رہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں چندر بھان وزیرِ اعظم تھے جامع مسجد شاہجہانی انہی کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران تعمیر ہوئی۔ مغل عہد میں اور اس سے قبل سلاطین کے عہد میں شعبہ مالیات بالعموم ہندوؤں کے پاس رہا۔

مسلم حکمرانوں کی اس مذہبی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ صدیوں پر محیط مسلم عہد میں مذہبی جنون کے نمونے بالکل نہیں ملتے۔ ہندو مسلم ہمیشہ یکجہتی کے ساتھ رہے۔ گاؤں گاؤں بستی بستی ہندو مسلم مل جل کر رہتے رہے۔ فرقہ وارانہ فسادات شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوئے جبکہ آج صرف پچاس سال کے عرصے میں مذہبی جنون کی بنیاد پر سینکڑوں فسادات ہو چکے ہیں۔

مسلم عہد میں اس یکجہتی کے بے شمار نمونے معاشرت، ثقافت اور ادب کی سطح پر موجود ہیں، یہاں ان کو نقل کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ مسلم سلاطین نے

اس ملک کی تعمیر و ترقی خون جگر سے کی تھی۔ انہوں نے اس کو اپنا وطن بنایا۔ یہاں کی تہذیب و تمدن اور بود و باش اختیار کیا۔ آج کے قومی کلچر کی تشکیل انہی مسلم سلاطین کے زیر اثر ہوئی، اس کے باوجود ان کو متعصب، غاصب یا غیر ملکی قرار دینا حد درجہ بد دیانتی ہے۔ بایں ہمہ موجودہ مسلمانوں نے ان حکمرانوں کو کبھی اپنا آئیڈیل نہیں بنایا۔ نہ ان کی عظمتوں کے گن گائے اور نہ ان کو سرمایہ افتخار سمجھا۔ ان کی عظمتوں کے گن اگر گائے ہیں تو مورخوں نے، جن میں سے اکثریت ہندو مورخین کی ہے اس لیے مسلمانوں کو ان مغل حکمرانوں سے وابستہ کرنا اور ان سے یہ مطالبہ کرنا کہ ان سے اپنی برأت کا اظہار کریں محض خواہ مخواہ کا مطالبہ ہے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے دور حکومت کے مظالم کے لیے ہندوؤں سے معافی مانگیں اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جاپانی وزیر اعظم نے کوریا کے عوام سے معافی مانگی تھی، لیکن یہ مطالبہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ مسلمانوں نے مسلم عہد میں ہندوؤں پر مظالم ڈھائے جب کہ تاریخ کی کسوٹی پر یہ مفروضہ باطل قرار پاتا ہے۔

مسلمانوں سے ایک مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ یہاں رہنا چاہیں تو ان کو یہاں کی بود و باش اختیار کرنی ہوگی اور یہاں کا رہن سہن اختیار کرنا ہوگا۔ یہ مطالبہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ مسلمان رہتے تو یہاں ہیں لیکن بود و باش کہیں اور کی رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں تقریباً ایک ہی انداز اور ایک جیسے طور طریقوں سے رہتی ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر فرق ہے تو سماجی نوعیت کا نہیں بلکہ مذہبی نوعیت کا ہے۔ مثلاً مسلمان اپنے مذہبی امور اسلام کے مطابق انجام دیتے ہیں اور ہندو اپنے عقیدے اور رسوم کے مطابق۔ اگر اس مطالبے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھی انہی رسوم اور رواج اور طریقوں کو اختیار کر لیں جو ہندوؤں یا دوسرے مذاہب۔ کے لوگ انجام دیتے ہیں تو یہ سراسر غلط اور خلاف آئین ہے۔ کثیر مذہبی معاشرے میں مذہبی زندگی، قومی زندگی نہیں ہوسکتی بلکہ ہر طبقے کی اپنی زندگی ہوتی ہے اپنا رواج اور اپنا دستور ہوتا ہے۔ ان طبقات سے ان کا طریقۂ عبادت یا ان کا مخصوص مذہبی تشخص ختم کرنے کا مطالبہ اس کی آزادی سلب کرنے کے مترادف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان اپنا طریقہ عبادت نہ تبدیل کریں لیکن ہولی اور دیوالی جو یہاں کے قومی تیوہار ہیں ان میں تو شرکت کر سکتے ہیں لیکن یہ بات بھی درست نہیں۔ کیوں کہ قومی تیوہار یوم آزادی اور یوم جمہوریہ ہیں، جن کو مسلمان مناتے ہیں۔ ہولی اور دیوالی قومی نہیں بلکہ ہندوؤں کے اپنے

مذہبی تیوہار ہیں ان میں شرکت کا مسلمانوں سے مطالبہ کرنا کسی طرح درست نہیں۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مسلمان قومی دھارے سے جدا ہیں، ان کو قومی دھارے میں شامل ہونا چاہیے لیکن یہ بھی مغالطہ ہے۔ اس لیے کہ قومی دھارے کی وضاحت نہیں کی جاتی کہ اس سے کیا مراد ہے۔ اول تو اس کی وضاحت ہو ہی نہیں سکتی، دوسرے وہ خود بھی اس کی وضاحت نہیں کرنا چاہتے، بلکہ اس لفظ کو مبہم رکھتے ہیں تاکہ حسب ضرورت اس کی تفہیم کی جاسکے۔ امکانی طور پر قومی دھارے سے درج ذیل باتیں مراد ہوسکتی ہیں۔

اگر اس سے مراد مذہبی زندگی یا مذہبی رسوم وروایات لی جائیں تو لفظ بے معنی ہے۔ اس لیے کہ ہندستان ایک سیکولر ملک ہے، جس میں مختلف مذاہب کے لوگ اپنی مذہبی آزادی کے ساتھ رہتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو مکھیہ دھارا یا قومی ڈھانچہ قرار دینا خلاف آئین ہے۔ اگر اس لفظ سے مراد ملک کا سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ ہے تو یہ مطالبہ گمراہ کن ہے۔ اس لیے کہ مسلمان ہندستان کے سماج اور سیاست کے ساتھ ساتھ ادب، آرٹ، تعلیم، تہذیب، تمدن اور ثقافت سب میں اپنا فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ قومی ڈھانچہ سے جدا ہرگز نہیں ہیں۔

مسلمانوں نے جنگ آزادی میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ اس کا تذکرہ اجمالاً شروع میں ہو چکا ہے اور اس پر متعدد تحقیقات شائع ہوئی ہیں۔ ہزاروں مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں ملک کی آزادی میں دی ہیں، آزادی کے بعد بھی ان کا کردار نمایاں اور فعّال رہا ہے، تعلیم وثقافت کے میدان میں ملک کی حفاظت و سالمیت کی راہ میں، ادب اور کھیل کے میدان میں مسلمانوں کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ یہاں اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے۔ یہ چند اجمالی باتیں ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ہندستان کی متعدد جامعات کے بانی اور سربراہ مسلمان ہیں۔ وزارت تعلیم کی ابتدائی گراں قدر خدمات مولانا آزاد اور دوسری نمایاں مسلم شخصیات نے انجام دیں۔ ملک کی سالمیت اور عسکری حفاظت میں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام، بریگیڈیر عثمان اور عبدالحمید کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کا سماجی نظام عام ہندستانیوں سے جدا ہے۔ مسلمانوں کے سماجی نظام کا ایک حصہ تو وہ ہے، جو مذہبی ہے۔ لہٰذا وہ تو زیر بحث ہی نہیں ہے۔ ایک حصہ ایسا ہے جسے سماجی کہا جاسکتا ہے اور مذہب نے اس کے سلسلے میں واضح ہدایات نہیں دی ہیں۔ مثلاً عورتوں کی سماجی اور ثقافتی سرگرمیاں، اس کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ مسلم

خاندانوں میں عورت گھر کی چہاردیواری میں محبوس سمجھی جاتی ہے۔ اس کو بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں اور وہ معاشرے کا ایک عضو معطل بن کر رہ گئی ہے۔ یہ الزام اس حد تک تو درست ہے کہ مسلم خواتین کا موجودہ سماجی سرگرمیوں میں تناسب دوسروں سے کم ہے۔ لیکن مکمل طور پر ان کا کوئی حصہ ہی نہ ہو یہ درست نہیں۔ ادب، ثقافت، سیاست، معیشت اور تعلیم کے میدان میں مسلم عورتوں کی نمائندگی موجود ہے۔

اس موقعے پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ آج کے دور میں سماجی سرگرمیوں کی جس انداز پر تشریح کی جاتی ہے اور جو سرگرمیاں منصۂ شہود پر نظر آتی ہیں، ان میں بیشتر ایسی ہیں جو عورت سے اس کی بہت سی خصوصیات چھین کر اسے حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً سیاسی سرگرمیاں یا فلم اور بعض ذرائع ابلاغ میں نمائندگی وغیرہ۔ اگر مسلم خواتین کا تناسب اس میں کم ہے تو معیوب بھی نہیں۔ اس لیے کہ عفت وعصمت اور پاکیزگی کا جو تصور ان میں پایا جاتا ہے، وہ قابل صد افتخار جوہر ہے۔ اگر مسلم خواتین موجودہ عوامی زندگی کی شکستہ کشتی پر سوار ہو کر اپنی عفت وعصمت کو اشارہ ہائے انگشت کا نشانہ نہیں بنانا چاہتی تو یہ سماجی پسماندگی نہیں بلکہ سماجی برتری ہے۔ اس کا صحیح مشاہدہ موجودہ معاشرے پر نظر ڈالنے سے ہوسکتا ہے۔ ملازم پیشہ خواتین کس درجہ مصیبت کا شکار ہیں۔ اس کا اندازہ ان سروے رپورٹوں سے ہوسکتا ہے، جو اس سلسلے میں کی گئی ہیں۔ دفاتر میں سب سے زیادہ محنت کرنے والی اور سب سے کم اجرت پر عورت ہی ملتی ہے۔

مسلمانوں کے حوالے سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ان کے مقامات مقدسہ ہندستان کے باہر عرب میں ہیں۔ اس لیے یہ عرب کے تو وفادار ہوسکتے ہیں لیکن ہندستان کے نہیں۔ یہ محض اعتراض برائے اعتراض ہے، اس میں کوئی جان نہیں ہے۔ اگر سیاسی وفاداریوں کی روشنی میں مقدس مقامات کا تعین کیا جاتا تو دنیا کا کوئی فکر وفلسفہ یا دین ومذہب اپنے مخصوص جغرافیائی خطے سے تجاوز نہ کرپاتا۔

یہ بات آج کے عمومی طرز عمل کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی بڑی تعداد دنیا کے مختلف ممالک میں رہتی ہے لیکن کہیں بھی اس بنا پر ہندووں کی وفاداری پر شک کی نگاہ نہیں ڈالی گئی کہ ہندوؤں کے مذہبی مقامات ہندستان میں ہیں، اس لیے وہ یہاں کے وفادار نہیں ہوسکتے۔ بلکہ خود ہندتووادی بھی کبھی یہ نہیں کہتے کہ سکھوں کے مذہبی مقامات پاکستان میں ہیں اس لیے یہ ہندستان کے وفادار نہیں۔ دراصل یہ کوئی معقول بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک طبقہ مسلمانوں کو دبانے کے لیے اس طرح کے شگوفے چھوڑتا رہتا ہے۔

طلاق اور تعدد ازدواج کے حوالے سے بھی مسلمانوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ دو چیزیں ان کو قومی زندگی سے جدا کرتی ہیں۔

جہاں تک طلاق کا سوال ہے تو کسی بھی صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ طلاق کی حقیقت یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کسی ذہنی ناہمواری کی وجہ سے ایک ساتھ نہ رہ سکیں تو بہتر طریقے پر الگ ہو جائیں اور دوسرا شریک حیات منتخب کرلیں۔ یہ علیحدگی اگر شوہر کی طرف سے ہو تو طلاق کہلاتی ہے اور اگر بیوی کی طرف سے کسی عدالت کے ذریعے ہو تو خلع کہلاتی ہے۔ کسی بھی صالح معاشرے کے قیام کے لیے طلاق اتنی ضروری ہے کہ جن اقوام و ملل میں طلاق کا رواج نہیں تھا انہوں نے اپنے آپ کو زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے اپنے قوانین میں طلاق کی دفعہ کا اضافہ کروایا ہے۔

اسلام میں طلاق کے لیے کوئی متعینہ وجہ نہیں ہے۔ صرف ذہنی ہم آہنگی یا مزاج کی عدم موافقت اس کے لیے کافی ہے۔ اس میں بھی بڑی حکمت ہے، اگر طلاق میں کوئی متعینہ بات ہوتی تو اس کے مضمرات یقیناً غلط ہوتے، جیسے ہندو کوڈ بل کے مطابق صرف چھ صورتیں ہیں، جب عورت کو طلاق دی جاسکتی ہے۔

۱۔ بدکاری ۲۔ ترک مذہب ۳۔ جذام ۴۔ امراض خبیثہ ۵۔ سنیاس لینا ۶۔ مفقود الخبر ہو جانا۔

ان میں سے بدکاری اگر عدالت میں ثابت کی جانے لگے تو یہ حد درجہ فحش بات ہوگی اور اس سے طلاق کا مقصد بھی فوت ہو جائے گا۔ اس لیے کہ طلاق کا مقصد یہ ہے کہ زوجین علیحدگی اختیار کر کے دوسرا شریک حیات منتخب کرلیں لیکن اگر عدالت میں دونوں میں سے کسی کی بھی بدکاری ثابت ہو جاتی ہے تو پھر اس سے کون شادی کرنے پر رضامند ہوگا۔

اس لیے اسلام نہ تو بدکاری کو لازمی طور پر وجہ طلاق قرار دیتا ہے نہ جذام اور امراض خبیثہ کو۔ ان امراض کی شکل میں اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ آدمی طلاق نہ دے بلکہ اس کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ازدواجی ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسری شادی کرلے۔

تعدد ازدواج اسلام میں کوئی حکم یا فریضہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک حل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے چار شادیاں کرنے کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ مردوں کو پابند کیا ہے کہ وہ چار سے زائد شادیاں نہ کریں۔ عرب ہند بلکہ ساری دنیا میں عہد قدیم سے تعدد ازدواج کا عمل رہا

ہے۔ اسلام نے پابند کیا کہ اگر ایک سے زائد شادیاں کی جائیں تو کسی بھی صورت میں وہ چار سے زائد نہ ہوں، جہاں تک ہندستانی روایات کا تعلق ہے تو یہ ملک تعدد ازدواج سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ عہد قدیم سے ہی یہاں متعدد بیویاں رکھنے کا رواج رہا ہے۔ ویدک لٹریچر میں ایک ایک شخصیت کی سینکڑوں بیویوں کا تذکرہ ملتا ہے اور آج بھی ہندوؤں میں تعدد ازدواج کا تناسب مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ ہندوؤں میں یہ تناسب ۵ء۰۶ ہے، جبکہ مسلمانوں میں ۴،۳۱ اور مسلمانوں میں شادیاں کرنے کی ایک حد مقرر ہے، جبکہ ہندوؤں میں اس طرح کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ آج بھی دس دس شادیاں کرنے والے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر راجستھان کے بھیکا جی تگاجی کی ۹ بیویاں اور ۳۲ بیٹے بیٹیاں زندہ ہیں۔ ان شواہد کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں پر کیا جانے والا یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے۔

باب چہارم

ہندتو: چند جدید مسائل

خارجی تہذیب

ہندتو کی تحریک خارجی تہذیب (Culture) کو ملک بدر کرنا چاہتی ہے۔ اس کی نظر میں خارجی تہذیب ملک دشمن ہے اور قومی تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ تہذیب زندگی کے ہر گوشے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ سیاست، معاشرت، معیشت، زبان، ادب حتی کہ طرز رہائش تک میں اس کے اثرات کو ختم کردینا اور اس کی جگہ ملکی تہذیب اختیار کرنا ہے۔

سیاست میں جمہوریت، نظام انتخاب، سیکولرزم وغیرہ کی سخت مخالفت ان لوگوں نے کی ہے۔ اس فکر کے مطابق جمہوریت ایک ایسا طرز حکومت ہے جو یوروپ کی لامحدود شہنشاہیت کے مقابلے میں ردعمل کے طور پر ظاہر ہوا۔ یہ جس قسم کے نظام حکومت کا مطالبہ کرتے ہیں وہ ایسا نظام ہے، جس میں نہ کوئی راجہ ہو، نہ پرجا۔ ہر شہری کی حفاظت دوسرے شہری سے دھرم کے ذریعہ ہوتی ہو[۹۹] گولوالکر جمہوریت کو زہر کہتے ہیں۔[۱۰۰] معاشی سطح پر کمیونزم کو ملک دشمن قرار دیتے ہیں۔ گولوالکر کے عہد تک کمیونسٹ خاصے مضبوط تھے۔ کئی ریاستوں میں ان کی بڑی نمائندگی تھی۔ اس لئے اس کو بھی مستقل خطرہ سمجھتے تھے اور انہوں نے ملک کو درپیش بڑے خطرات میں سے ایک مسلمان دوسرے کمیونسٹ لوگوں کو شمار کرایا ہے۔[۱۰۱] کمیونزم بھی خارجی تہذیب ہے اس لیے اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔

اسی طرح مساوات کا نظریہ بھی خارجی تہذیب میں شمار ہوتا ہے۔ چونکہ یہ نظریہ قومی دھرم ورن آشرم پر ضرب لگاتا ہے اس لیے ہندتو کے حاملین مساوات انسانی کے بھی خلاف ہیں۔

گرو گولوالکر نے واضح طور پر لکھا ہے کہ یکجہتی مساوات کے ذریعہ پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ توازن سے پیدا ہوتی ہے اور یہ توازن دھرم کے ذریعے برقرار رکھا جاتا ہے۔ [۱۰۲]

قضیہ بابری مسجد

بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعے کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد اقتدار میں ہزاروں مندروں کو منہدم کیا اور ان کی جگہ مساجد تعمیر کیں، انہیں مساجد میں سے ایک بابری مسجد بھی ہے۔ اس طرح کی تین ہزار مسجدوں کی فہرست بھی پیش کی جاتی ہے کہ مسلمان ان مساجد کو واپس کریں۔

اس قضیے پر سینکڑوں مضامین اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ ابھی تک وہیں ہے جہاں روز اول تھا۔ اس کی وجہ معروضیت اور معقولیت کا فقدان ہے۔ برادرانِ وطن نے اس کو زبردستی قومی مفاخرت کا مسئلہ بنا لیا ہے اور اس کی واقفیت اور اس کے عواقب پر نظر نہیں رکھتے۔ اگر اس کی واقعیت پر مثبت اور غیر جذباتی انداز سے نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ مسئلہ سنجیدہ فکر سے عاری ہے۔ اس مسئلے میں سب سے اہم بات یہ ہونی چاہیے کہ تاریخ کے دھارے کو سامنے رکھا جائے۔ ہندستان کی تاریخ میں متعدد ادوار ہیں اور ہر دور میں کسی نہ کسی مذہب کی عظمت حاوی رہی ہے۔ بدھوں سے قبل ایک مذہب کا غلبہ تھا، بدھوں کے چھ سو سالہ عہد کے بعد ایک دوسرا مذہب حاوی ہوا، پھر اسلام آیا اور آخر میں عیسائیت چھائی رہی۔ اس لیے تاریخ کے صفحات میں اتنی تہیں نکلیں گی کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور نہ معقولیت کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

بابری مسجد کے سلسلے میں شدت پسند ہندو موقف یہ ہے کہ یہاں رام مندر تھا یا یہ رام کا مقام پیدائش ہے، لیکن اس کے لیے ان کے پاس کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے وہ اس کو اپنے عقیدے کا مسئلہ بتاتے ہیں، ان کا یہ دعوی درست نہیں، کیوں کہ رام کے بھگوان ہونے کا مسئلہ تو عقیدے کا ہو سکتا ہے لیکن یہ مسئلہ کہ رام نے بحیثیت انسان کہاں جنم لیا تھا یہ عقیدے کا نہیں تاریخ کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کو تاریخ کے حوالے کرنا چاہیے اور تاریخ کے ہی فیصلے کو تسلیم کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کا موقف یہی ہے کہ اگر مؤرخین یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ یہاں رام مندر تھا اور

اسے توڑ کر مسجد بنائی گئی تھی تو فیصلے کے مطابق مسلمان اس کے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں گے اور یہ فیصلہ صرف اسی مسجد کے ساتھ ہونا چاہیے باقی مساجد اور مذہبی مقامات کے لیے معقول حل یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کی حیثیت کو معیار مان لیا جائے۔ اگر اس طرح تاریخ کی تصحیح کرنے کی کوشش کی جاتی رہی تو اس سے حاصل تو کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن ملک کی بہترین صلاحیتیں بے مصرف ضائع ہوں گی۔ ہزاروں سال کے وقفے میں ہندستان کے اندر بے شمار انقلابات آئے اور ان انقلابات کے گونگے نقوش اس زمین میں دفن ہیں ان سے زبردستی اپنی بولی بلوانا اور کسی مزعومہ تصور کو امر واقعہ کے طور پر تسلیم کرنا اور دوسروں پر بھی اسے تھوپنا ایک ایسی کوشش ہے، جسے آج کے روشن عہد میں معقولیت پر مبنی نہیں کہا جا سکتا۔

ان توضیحات کے بعد یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ ہندستان میں مسلمان ہمیشہ ایک بہترین شہری کی طرح رہے ہیں۔ یہاں کے سماج اور یہاں کی معیشت میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ملک کے لیے بہترین خدمات انجام دیں اور آج بھی وہ ایک اچھے شہری اور قانون کا احترام کرنے والے انسان کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ آج بھی وہ ملک وقوم کی بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کچھ مخصوص افراد اپنے ذاتی وسیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے زبردستی مسلمانوں کو مطعون کر رہے ہیں۔ ان کی کوشش معقولیت پر مبنی نہیں ہے بلکہ معقولیت اس کے برخلاف ہے کہ مسلمان بہترین شہری ہیں۔

تبدیلیٔ مذہب

ہندتو کی تحریک تبدیلی مذہب کے خلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر مذہب خدا تک رسائی کا ذریعہ ہے تو وہ کسی بھی طریقے سے ہوسکتی ہے۔ سارے راستے اسی کی طرف جاتے ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے لئے مذہب تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ گروگولوالکر نے ایک جرمن عیسائی کا قصہ سنایا جو ہندو ہونا چاہتا تھا لیکن اس کو یہ کہہ کر منع کر دیا گیا کہ اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہو تو وہ عیسائیت کے ذریعہ بھی ممکن ہے۔[103]

گروجی نے ایک اور مقام پر کہا ہے کہ ہمارا مذہب تبدیلی مذہب نہ کرانے والا مذہب ہے۔ مذہب تو سیاسی یا دیگر وجوہ[104] کی بنا پر تبدیل کرائے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم تبدیلی مذہب کے خلاف ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے تمہیں اچھا لگے تو قبول کر لو ورنہ چھوڑ دو۔[105] خود

مہاتما گاندھی بھی تبدیلی مذہب کے خلاف تھے۔ انہوں نے کئی مقامات پر تبدیلی مذہب کی مخالفت کی ہے[۱۰۶] لیکن ان لوگوں کا یہ دعویٰ تاریخ کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ ہندستان میں قدیم عہد سے تبدیلی مذہب کی روایت رہی ہے۔ آریوں کے بعد یہاں وسط ایشیا سے دوسری اقوام بھی آئیں، جن میں ہن اور سیتھین قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ہندستان کو فتح کر کے یہاں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ اسی طرح راجپوتوں کے بارے میں مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہ آریہ نہیں ہیں بلکہ بعد کے ادوار میں ہندستان آئے۔ یہاں اپنی حکومتیں قائم کیں، جس وقت مسلمانوں نے ہندستان کو فتح کیا، اس وقت شمالی ہند پر راجپوت حکمرانوں کی فرماں روائی تھی۔ ان سب اقوام نے ہندو مذہب اختیار کیا اور یہاں کے نظام میں ایسے جذب ہو گئے کہ اپنی اصل شناخت بھی گم کر بیٹھے، بلکہ آج اصل ہندو یہی لوگ محسوس ہوتے ہیں۔

تاریخی شواہد یہ بھی بتاتے ہیں کہ انڈونیشیا، ملیشیا، جاوا، جافنا، سماترا، فلپائن وغیرہ مشرق اقصیٰ کے متعدد ممالک میں ہندو مذہب پھیلا اور آج تک اس کے اثرات وہاں کی تہذیب پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ خود گولوالکر کو اس کا اعتراف ہے بلکہ وہ اس کو ہندستانی مسلمانوں کے لیے آئیڈیل بتاتے ہیں۔[۱۰۷]

۱۸۹۰ء میں سوامی دیانند سرسوتی ہندو مذہب کی تبلیغ کے لیے امریکا گئے۔ آج بھی دنیا کے مختلف حصوں خاص طور پر یوروپ میں وقتاً فوقتاً ہندو مذہب اختیار کیا جاتا رہتا ہے۔ اس کی سرپرستی یہاں کی ہندو تنظیمیں کرتی ہیں۔ ان شواہد کی روشنی میں یہ کہنا کہ ہندو مذہب تبدیلی مذہب کے خلاف ہے، ایک ایسا دعویٰ ہے جو حقائق کے خلاف ہے اور جس کی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہندو مذہب اصلاً اس تبدیلی مذہب کے خلاف ہے، جس میں کوئی ہندو دوسرا مذہب اختیار کرے۔ دوسرے لوگوں کے ہندو ہونے کو تو یہ گھر واپسی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ہندو کے عیسائی یا مسلمان ہو جانے کو یہ آراشٹریتا یا غیر ملکی ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔[۱۰۸] اس لیے ان لوگوں کو پریشانی ہندوؤں کی تبدیلی مذہب سے ہوتی ہے اور تبدیلی مذہب کے خلاف جو قانون یہ بنوانا چاہتے ہیں، اس کے مطابق بھی صرف یہ تبدیلی چاہتے ہیں کہ کوئی ہندو دوسرا مذہب اختیار نہ کرے دوسرے چاہیں تو ہندو ہو جائیں، بقول گولوالکر ہندستان میں رہتے ہوئے قومی غیرت کا تقاضا ہے کہ انہیں ہندو ہو جانا چاہیے۔

ہندو ارباب فکر سارو دھرم سمانا (تمام مذاہب برابر ہیں) کے قائل ہیں۔ ان کے

مطابق ہر دھرم خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ گرو جی بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں اور ہندو مذہب کی روایتی رواداری کے حوالے سے بھی یہی بات بتائی جاتی ہے لیکن حالیہ دنوں میں تبدیلی مذہب کی بنیاد پر جو ہنگامہ آرائی ہوئی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں بھی تمام مذاہب برابر نہیں ہیں۔ ان کا پہلا دعویٰ درست نہیں ہے اور وہ صرف ہندو مذہب کو ہی حق مانتے ہیں۔ اگر سارے مذاہب برابر ہوتے تو کسی ہندو کا عیسائی ہو جانا بھی تو ہندو ہونا ہے کیوں کہ ہندو ہر طریقہ عبادت اور ہر مذہب کو برحق مانتا ہے پھر یہ ہنگامہ آرائی کیوں۔ خواتین کی عزت و ناموس پر محض اس لیے حملے کہ وہ ہندو نہیں ہیں۔ کیا ہندو مذہب اس کی اجازت دیتا ہے کہ انسانیت کی بھلائی کے لیے سرگرم انسانوں اور معصوم بچوں کو زندہ جلا دیا جائے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہندو دھرم چھوڑ دینا دراصل ہندو مذہب کی تحقیر ہے اور کسی مذہب کی تحقیر کرنا دستور ہند کے منافی ہے۔ [۱۰۹] لیکن یہ بھی مغالطہ ہے۔ اول تو یہ تحقیر نہیں بلکہ آزادی مذہب کا حق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندو روایات کے مطابق اگر تمام دھرم برابر ہیں تو منطقی طور پر عیسائیت اور ہندو دھرم دونوں مساوی قرار پاتے ہیں۔ اب اگر ایک عیسائی ہندو ہو جائے تو عیسائیت کی تحقیر لازم نہیں آنی چاہیے۔ ٹھیک اسی طرح کسی ہندو کے عیسائی ہو جانے سے ہندو مذہب کی تحقیر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہوا جیسے آدمی اپنے ایک گھر میں سے نکل کر اپنے ہی دوسرے گھر میں چلا جائے۔ گاندھی جی اس تبدیلی کو ایک باڑے سے نکل کر دوسرے باڑے میں چلے جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک باڑے سے دوسرے باڑے میں جانا کس طرح پہلے باڑے کی تحقیر ہوگی؟ اور بالفرض اگر اس کو تحقیر مانا بھی جائے تو سب سے پہلے دستور ہند کی تحقیر ہے، جس نے مذہب اختیار کرنے کی آزادی عطا کی ہے اور اپنے عقیدے کی تبلیغ کا حق بھی دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ دستور ہند کے مطابق ہندستان کے تمام مذاہب برابر درجے کے ہیں تو ہندستان میں رہتے ہوئے جس طرح ہندو مذہب ترک کرنا اس کی تحقیر ہے اسی طرح عیسائیت ترک کر کے ہندو ہو جانا بھی عیسائیت کی تحقیر ہے۔ پھر اس پر تنقید کیوں نہیں کی جاتی اسے گھر واپسی سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے۔

آج کا دور افکار و اعمال کی آزادی کا دور ہے۔ آج کسی انسان کے ذہن پر پابندی عائد کرنا، اس سے سوچنے سمجھنے اور معقولیت کے ساتھ جینے کا حق چھیننا پسماندگی اور جہالت ہے۔ آج دنیا اتنی سمٹ گئی ہے کہ انسانوں کو کسی مخصوص جغرافیائی خطے کا پابند نہیں بنایا جا سکتا اور نہ اسے

مخصوص افکار میں محصور کیا جاسکتا ہے۔ برادرانِ وطن کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ آج ایسے مسلمان بھی موجود ہیں، جنھوں نے اسلام ترک کر دیا لیکن مسلم سوسائٹی ان کو پابند نہیں کر سکی تو اگر کچھ ہندو حق کی تلاش یا سماجی انصاف کے حصول کے لیے یا شرک سے نفرت کی وجہ سے عیسائیت یا اسلام اختیار کرتے ہیں تو کس منطق کی رو سے انہیں اس سے روکا جاسکتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ عیسائیت اور اسلام غیر ملکی مذاہب ہیں تو آج ملکی کیا ہے۔ کیا علم و سائنس ملکی ہیں۔ کیا آج کا فلسفہ، آج کا جمہوری نظام حکومت، آج کا قانون ملکی ہیں، آج کا طرز حیات، آداب رہائش، طرز معاشرت، اسباب عشرت و ثروت ملکی ہیں، دراصل آج ملکی اور غیر ملکی کا تصور ہی ختم ہو گیا۔ آج پوری دنیا ایک ملک ہے اور قدیم عہد کا مختلف ملکوں اور قوموں کا سرمایہ آج عالم انسانیت کا سرمایہ ہے۔ آج ملکی اور نسلی چیزوں کی گفتگو کرنا رجعت قہقری کے ہم معنی ہے۔

تبدیلی مذہب کے سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ عیسائی مشنریاں اور مسلمان ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر اور لالچ دے کر عیسائی اور مسلمان بنا رہے ہیں۔ لیکن یہ الزام بھی بے بنیاد ہے چوں کہ اس ملک میں غالب اکثریت ہندوؤں کی ہے اور انہیں خود بھی اس کا زعم ہے۔ ایسے میں مسلمانوں کا کسی کو دھمکا کر مسلمان بنانے کی بات کہنا کتنا مضحکہ خیز ہے۔ رہی لالچ کی بات تو یہ بھی غلط ہے۔ چوں کہ حکومت، اسباب ثروت اور مال و دولت کی فراوانی ہندووں کے پاس ہے، مسلمانوں کے پاس نہیں۔ اس لیے یہ بات بھی قرین قیاس نہیں۔

جو لوگ حق کی تلاش میں تبدیلی مذہب کرتے ہیں ان کو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت مذہب تبدیل کرنے سے نہیں روک سکتی۔ تاریخ کے صفحات ایسے اصحاب عزیمت کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں، جنھوں نے محض تلاش حق میں تبدیلی مذہب کا اقدام کیا اور جو محض سماجی انصاف اور صدیوں کے ظلم و ستم کے ردعمل میں مذہب تبدیل کر رہے ہیں تو ان کو روکنے کا ایک ہی واحد طریقہ ہے کہ ان کو انسانیت کا عطا کردہ سماجی مقام دیا جائے اور ظلم و ستم کی جو سنگین داستانیں ان سے وابستہ ہیں، ان کا مداوا کرنے کی کوشش کی جائے، زبردستی، قتل و غارتگری اور مردم سوزی اور حیا سوزی کے واقعات نہ صرف ہندستان بلکہ ہندو مذہب کے نام پر کلنک ثابت ہوں گے۔ اور ان سے ردعمل بھی شدید ہوگا جو ملک کے اتحاد و سالمیت کے لیے خطرناک ہوگا۔

حواشی

ا۔ موجودہ ہندتو کی فکر مذہب، سماج وغیرہ تمام چیزوں سے صرف نظر کر کے صرف تقدیس ہند کے مفروضہ اور طبقاتی نظام کے احیاء پر مبنی ہے، تفصیلات اگلے صفحات میں ہیں۔ (مصنف)

۲۔ Benjamin Walkar: Hindu World, vol. 1pp 389

۳۔ सावरकर जीवन दर्शन प्र0 133 (حالانکہ ساورکر کا یہ خیال بے معنی ہے چونکہ دوسروں کے دئے ہوئے القاب سے عظمتوں کا نہیں صرف غلامی کا احساس ہوسکتا ہے۔)

۴۔ The Complet mark, vol. 3 pg 372, 379

۵۔ रामेश्वर मिश्रा : गौमा प्र0 12

۶۔ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड प्र0 98

۷۔ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंडर प्र0 100

۸۔ Bunch of thought 130

۹۔ Girilal Jain : Hindu Phenomenon pp-14

۱۰۔ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 1, प्र0 41–43

۱۱۔ Benjamin walkar: Hindu world. 2 vols.

۱۲۔ Organiser Dec. 24, 1995

۱۳۔ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 4 प्र0 27

۱۴۔ K. R. Malkani : what does Hindutua means (Hindustan) Times Oct. 10, 1993

۱۵۔ संघवृक्षकेबीज : डा0 हैडगैवार, 45–47

भानौ प्रताप शुक्ल : राष्ट्र प्र0 303

خارجی عناصر سے پاک کرنے کی بات آر۔ایس۔ایس کے لیڈروں نے کہی ہے اور بہت

واضح الفاظ میں کہی ہے۔ مسلمانوں کو متعدد جگہ سانپ، سنپولیہ کہا ہے۔ان پر وحشت و بربریت کے الزامات لگائے ہیں اس سلسلے میں درج ذیل کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

1. Bunch of thoughts (Golwalkar)

2. राष्ट्रीय स्वयं सेवक संघ : तत्व और व्यवहार (हैडगेवार)

3. जी गुरूजी समग्र दर्शन (गोलवालकर)

4.हिन्दु – मुस्लिम एकता : भर्म और वास्तविकता (B. N. Jog)

5. भारतीय इतिहास के छः स्वर्णिम पुष्ट (सावरकर)

۱۶۔ ہندی الاصل (Indic) ایک مبہم اصطلاح ہے۔لیکن اس سے مراد صرف برہمنی نظام لیا جاتا ہے۔ بدھ مت ، جین مت اور لنگایت وغیرہ افکار جو ہندستان ہی میں پروان چڑھے، ہندتووادی ان کو بھی ملک دشمن قرار دیتے ہیں۔

۱۷۔ गुरूजी समर्ग दर्शन खंड 2 पु0 95

۱۸۔ रामेश्वर मिश्रा गो माता पु0 12–13

۱۹۔ Bunch of thoughts P. 48

۲۰۔ Bunch of thoughts P. 48-9

۲۱۔ Bunch of thoughts P. 51

۲۲۔ Integear Humanism manthus, July 1941

۲۳۔ Bunch of thoughts P. 107

۲۴۔ Bunch of thoughts P. 139

۲۵۔ Bunch of thoughts P. 129

۲۶۔ V. D. Saverkar. Hindutva : pp

۲۷۔ V. D. Saverkar. Hindutva : pp

۲۸۔ Girilal Jain : The Hindu Phenomenon pp. 14

۲۹۔ Complete world of so vivekanand . vol 3 pp 371

۳۰۔ Vivekanand : My India The Eternal India p. 85

۳۱۔ Vivekanand : My India The Eternal India pp. 85

۳۲۔ The Hindu phenomenon pp 17

۳۳۔ The Hindu phenomenon pp 17

۳۴۔ Complete world of Vivekanand vol 3 pp 300-301

۳۵۔ The Hindu phenomenon p- 43, 45

۳۶۔ کرم یوگی، گیان یوگی یا بھکتی یوگی کے مقابلہ میں استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ محض فعال کے معنی میں ہے۔

۳۷۔ Bunch of thought pp 47-48

۳۸۔ Bunch of thought pp 49

۳۹۔ बंकिम चन्द्र चटर्जी : आनन्द मठ, बकिम संग्रह सम्पादक निहालचन्द्र वर्मा, प्रचारक ग्रंथावली योजना वाराणसी, तृतीय संस्करण 1989ए पु745

۴۰۔ ایضاً ص ۷۴۴

۴۱۔ Bunch of thought pp. 269-271

۴۲۔ Bunch of thought pp. 65

۴۳۔ Bunch of thought pp. 48

۴۴۔ श्री गुश्रजी समग्र दर्शन खंड 1 पु 9

۴۵۔ डा0 हैडगोवार : राष्ट्रीय स्वयं सेवक संघ तत्व और वयहप पु0 97

۴۶۔ श्री गुश्रजी समग्र दर्शन

۴۷۔ श्री गुश्रजी समर्ग दर्शन

۴۸۔ Bunch of thought p 113

۴۹۔ جدید ہندتو کی تحریک ہندو سماج کو تمام الوہی صفات سے متصف کرنا چاہتی ہے اس لئے ازلی صفت سے بھی متصف کیا ہے۔

۵۰۔ گرو جی نے آریہ جن اور سےتھین اقوام کی مداخلت کا ذکر نہیں کیا۔

۵۱۔ ساورکر نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا ہندی ترجمہ भारतीय نے गो0 न0 वेजापूरकर ईतिहास के छः स्वर्णिय पृष्ट کے نام سے کیا ہے۔اس میں ہندستان کی تاریخ خاص طور پر مسلم عہد کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جیسے مسلم حکمراں یہاں مستقل مذہبی نوعیت کی غارت گری کرتے رہے اور ہندو اپنے مذہب کی حفاظت کے لئے ان سے نبرد آزما رہے۔

۵۲۔ Bunch of thoughts p. 278

۵۳۔ مثلاً رام چندر جی کے عہد میں شمبو کرنامی شودر کو لفظ اوم سیکھنے کے جرم میں قتل کیا گیا۔

۵۴۔ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 4 पु0 30

۵۵ Bunch of thoughts p . 142

۵۶ Bunch of thoughts p 143

۵۷ Bunch of thoughts p 145

۵۸ Bunch of thoughts p 144

۵۹ Sri Aurobindo : The Foundation of Indian Culture p 113

۶۰ भारतीय ईतिहास के छः स्वर्णिय पृ0 71 67.70

۶۱ भारतीय इतिहास के छः स्वर्णिय पृ0 71

۶۲ भारतीय इतिहास के छः सवर्णिय पु0 67.70

۶۳ भारतीय इतिहास के छः सवर्णिय पु0 74

۶۴ B. R. Nanda : Mahatma Gandhi A Biography p . 345

۶۵ Bunch of thoughts p 132

۶۶ संकल्प पू 133

۶۷ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 3 पृ0 130

۶۸ یہاں ایک بات توجہ طلب ہے کہ مختلف ریاستوں میں ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کا اعتراف گرو جی نے کیا ہے۔

۶۹ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 2 पू0 92

۷۰ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 3 पू0 139

۷۱ संकल्प पु0 109

۷۲ Bunch of thoughts pp. 64

۷۳ संकल्प पु0 120

۷۴ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 2 पू0 122

۷۵ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 2 पू0 122

۷۵ Bunch of thoughts pp. 265-257

۷۶ Bunch of thoughts pp. 339-46

۷۷ بنکم چندر چٹرجی (۱۸۹۴-۱۸۳۸) ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ مشہور ترانہ ''وندے ماترم'' اس کا ہے۔ اس کی کتاب آنند مٹھ ان اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جس نے جارح ہندو قوم پرستانہ نظریہ کو غیر معمولی فروغ دیا اور ہندو احیاء پرستی کی تحریک کی ابتدا کی۔ اس کتاب کے علاوہ دیگر ۱۳ ناولوں میں بھی مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کی ہے۔ اس کی کتابوں

کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں جن سے اس کی مسلم دشمنی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس:

''راج سنگھ نے مشہور مارواڑی بہادر درگا داس کے ساتھ مل کر اورنگ زیب پر حملہ کیا اورنگ زیب ہار کر اور بے عزت ہو کر ڈنڈے سے مارے ہوئے کتے کی طرح بھاگا۔(राजसिंह पृ0 732) پردیس کا راجہ اپنی پرجا کے حالات کا خیال رکھتا ہے کیا ہمارے دیس کے مسلم راجہ ہماری حفاظت کر رہے ہیں۔ دھرم گیا، قوم گئی، عزت گئی اور اب تو جانوں کی بازی لگی، ان نشے باز داڑھی والوں کو بنا بھگائے کیا ہم ہندو رہ پائیں گے۔(आनन्द मठ 746) ''مہندر اور ستیہ آنند کے سنتانوں نے جہاں جہاں مسلمانوں کا گھر دیکھا اس میں آگ لگا دی (" 764) ''ٹھیک ہے ہم لوگ حکومت نہیں چاہتے۔ مسلمان بھگوان کا دشمن ہے۔ اس لیے ہم صرف ان کا ناش کرنا چاہتے ہیں۔(772) وغیرہ

۷۸ے سوامی شردھانند (۱۹۲٦) کا اصلی نام منشی رام تھا۔ والد سرکار انگریزی میں ملازم تھے۔ کچھ دن خود بھی ملازمت کی تھی۔ ہندو مذہب سے حد درجہ بے زار تھے۔ عیسائیت اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن بعد میں سوامی دیانند کی تقریریں سن کر آریہ سماجی ہو گئے۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے گروکل کے نام سے ویدک تعلیم کا ایک مرکز قائم کیا، خلافت تحریک میں شریک ہوئے۔ جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے خطاب کیا۔ لیکن بعد میں ان کا ذہن مسلم دشمنی پر آمادہ ہو گیا اور انہوں نے ہندی الاصل مسلمانوں کو از سر نو ہندو بنانے میں سرگرم حصہ لینا شروع کیا، ان کی کاوشوں کے نتیجے میں میرٹھ اور آگرہ کے اضلاع میں دو لاکھ ملکانہ راجپوت مرتد ہو گئے۔ غازی عبدالرشید نامی ایک نوجوان نے ان کو گولی مار دی جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔

۷۹ے सावरकर : भारतीय इतिहास के छः स्वर्गम पृ0 8–9

۸۰ے भारतीय इतिहास के छः स्वर्णिम पृ میں ہندستان کی تاریخ کا ہندو نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے اور ایک دوسری کتاب میں جنگ آزادی کی تاریخ کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔

۸۱ے हैडगाग्वार : राष्ट्रीय स्वंय सेवक संघ : तत्व और व्यवहार पृ0

۸۲ے India Vol IV P 110reedom Movment of fTara chand : History of

۸۳ے صلاح الدین عثمان: آر ایس ایس تعلیمات اور مقاصد ص ۲۷

۸۴ے صلاح الدین عثمان: آر ایس ایس تعلیمات اور مقاصد ص ۲۷

۸۴ے وویکانند کے الفاظ واضح طور پر اسلام کی تعریف پر مبنی ہیں، لیکن جب کوئی آمادۂ تاویل ہو تو وہ کیسی کیسی زقند بھرتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ گولوالکر اس جملے کی تاویل اسی طرح کرتے ہیں کہ اسلام سے مراد اسلام نہیں بلکہ مسلمانوں کا برابر کھڑا ہونا ہے۔ یعنی جس طرح

مسلمان برابر کھڑے ہوتے ہیں۔اسی طرح ہندو بھی برابر کھڑے ہونے لگیں۔

۸۵ Golwalkar : We and our Nationhood Definded P 44

۸۶ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 6 पृ0 224

۸۷ یہ گولوالکر کی عدم واقفیت کا عالم ہے۔غالباً گولوالکر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اسپین میں کوئی قومی داستان رقم کر کے وہاں غیر مسلم باشندوں کو تہہ تیغ کر دیا اور خود بلاشرکت غیرے وہاں کے مالک بن بیٹھے؟

۸۸ Bunch of Thouths 233-247

۸۹ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 6 पृ0 261

۹۰ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 6 पृ0 259

۹۱ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 6 पृ0 246

۹۲ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 6 पृ0 242

۹۳ گرو گولوالکر کو غلط فہمی ہوئی۔رستم مسلمانوں کا قومی ہیرو نہیں ہے، بلکہ وہ فارسی ادبیات کا ایک کردار ہے اور اسے اسی حد تک رکھا جاتا ہے۔

۹۴ مشہور چینی سیاح ہوین سانگ اور فاہیان نے مسلم عہد سے قبل ہندستان کا دورہ کیا اور یہاں پھیلی ہوئی انارکی پر تفصیل سے لکھا ہے۔

۹۵ شیخ اکرام: رود کوثر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور

۹۶ رام لعل نابھولی نے اردو اور فارسی کی رامائینوں پر تحقیقی کام کیا ہے، اس موضوع پر ان کے متعدد مقالے معارف (اعظم گڈھ) میں شائع ہوئے۔

۹۷ پھول والوں کی سیر

۹۸ India Today July 1997

۹۹ Bunch of thoughts pp. 33

۱۰۰ Bunch of thoughts pp. 139

۱۰۱ Bunch of thoughts pp. 257-265

۱۰۲ Bunch of thoughts pp. 34

۱۰۳ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 6 पृ0 237

۱۰۴ دوسری وجوہ سے ان کی کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت انہوں نے نہیں کی۔تاہم ان کے اس جملے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ تبدیلی مذہب کے وجوہ میں سیاسی وجوہ کے علاوہ بھی دوسری وجوہ کا سراسر انکار نہیں کرتے۔اس جملے میں آگے لکھا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہیں اچھا

لگےتو قبول کرلو ورنہ چھوڑ دو۔اس طرح گرو جی نے بلا ارادہ خود ہی دوسری وجوہ کی طرف اشارہ دے دیا۔تبدیلی کسی اچھائی یا کسی خوبی کے حصول کے لیے کی جاتی ہے اگر کوئی بات یا کوئی طریقہ کسی کو اپنے طریقے سے بہتر محسوس ہورہا ہے،تو اسے اس کو اختیار کرلینا چاہیے، یہی تبدیلی مذہب ہے۔اگر کسی کو ہندو دھرم اچھا لگتا ہے تو جس طرح اس کے لیے ہندو دھرم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اسی طرح اگر کسی ہندو کو اسلام مذہب اچھا لگےتو اسکے لیے اسلام کے دروازے کھلے ہونے چاہییں۔

۱۰۵۔ श्री गुरूजी समग्र दर्शन खंड 6 पू0 237

۱۰۶۔ Young India March 29, 1924, Dec. 17, 1925

۱۰۷۔ Bunch o f thoughts pp

۱۰۸۔ Bunch of thought.

۱۰۹۔ संकल्प पू0 137

مراجع

1. Golwalkar, M.S. : Bunch of thoughts, Banglore, 1980, Jagrana Prakash,Second revised Ed.
2. Girilal Jain: The Hindu Phenomenon, U.B.S. Delhi Ist.Ed. 1994.
3. Benjamin Walker: Hindu world.Munshiram Manoharlal, 1983.
4. Partap Chand: The Hindu mind, 1977, Indian Institute of advance studies, simla.
5. Hinduism, (Collection of Articals) Punjab University Patiala.1969
6. Rafiq Zakaria: The widening Divide, Viking, N.Delhi 1995.
7. Tapan Basu & others: Khaki shorts and saffron flags, orient Longman. 1993.
8. Bipin Chandra: Communalism in modern India.Vikas Publishing house, New Delhi Reprint 1993.
9. Harsh Narain: Myths of composite culture and Equality of Religions, voice of India New Delhi 1991.
10. Mehdi Arsalan & Janaki Rajan: Communalism in India, challange and Response, New Delhi- 1994
11. Jalalul Haq:Nation and nation-worship in India,Qazi Publishers, New Delhi 1992.
12. Swami Vivekanand, The Complete work. Adviata Ashram Calcutta, sixth Reprint 1994, 8.vol.

13. Swami Vivekanand,My India The External India Ist.Pub.1993 Calcutta.

14. Yogendra K. Malik & V. B.Sing, Hindu nationalist in India New Delhi 1995.

15. K. Jaya Prasad ; R.S.S & Hindu Nationalism, Deep Publications, New Delhi 1995

16. B. R. Nanda : Mahatma Gandhi, A biography. Oxford India Press. New Delhi 1996.

17. Sri Aurobindo: The Foundation of Indian, culture, Sri Aurobindo Ashram, Pondicherry seventh impression.

18. Times of India, Hindustan Times, India Today, Frontline,

19. Sitaram Keshary: Pseudo Hindusm Exposed, N. Delhi 1993 (A.C.P.I (m) Publication)..

हिन्दी

1. जी गुरूजी समग्र दर्शन (गुरू गोलवालकर के भाष्ण तथा वारताओं का संग्रह) भारतीय विचार साधना नागपुर, खंड 1–6 बिना सन्
2. डा० कैशव बली हैडगैवार : राष्ट्रीय स्वयं सेवक संघ : तत्व और व्यवहार, लोकहित प्रकाशन लखनऊ संवत् 2047 (वि०)
3. सावरकर : भारतीय इतिहास के छ : स्वर्णिम पृष्ठ हिन्दी अनुवाद गौ० नव बैजापूरकर, लोकहित प्रकाशन लखनऊ चतुर्थ संस्करण 1992
4. नारायण हरि पालकर : भगवा ध्वज लोकहित प्रकाशन लखनऊ 1992
5. डा० कैशव बली हैडगेवार, ज्ञान गंगा पंकाशन जयपुर
6. राम मनोहर लोहिया : भारत माता धर्ती माता, लोकभारती प्राकाशन इलाहाबाद1993
7. डा. रामलाल वर्मा : भाजपा : विचार, विजय और विश्वास, सूर्य भारती प्रकाशन नई दिल्ली 1993
8. रामेश्वर मिश्रा : गौ–माता भारत, भारती नई दिल्ली 1992
9. सुदर्शन : अग्नि–परीक्षा भारतीय विचार साधना नागपुर
10. परशुराम गोस्वामी : स्वामी जाद्धनन्द लखनऊ लोकहित प्रकाशन 1992
11. संकल्प (रा० स्व गंध के प्रस्ताव), सुरूचि प्रकाशन नई दिल्ली 1994
12. गोलवालकर, दीन दयाल उपाध्य : एकात्म मानव दर्शन गुरू जी प्रकाशन 1991
13. बंकिम चन्द्र चटर्जी : वाकिम समग्र, संपादक

اردو

۱۔ دعوت، ہندتوایک مطالعہ ۱۰رجنوری ۱۹۹۴، جلد ۴۲، شمارہ ۴

۲۔ صلاح الدین عثمان: آر۔ایس۔ایس تعلیمات ومقاصد، طبع اول ۱۹۹۳

۳۔ اسرار عالم: ہندتو، اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی ۱۹۹۵

۴۔ مجلّہ ترجمان القرآن، لاہور جلد ۱۲۵ شمارہ مئی ۱۹۹۸

۵۔قومی آواز وغیرہ۔